ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ

حفیظ ہوشیار پوری کا ایک نایاب خط: حواشی و تعلیقات

تعارف: حفیظ ہوشیار پوری (۵ جنوری ۱۹۱۲ء بمطابق ۱۵ محرم ۱۳۳۰ھ) جمعہ کے روز لائل پور (فیصل آباد) سے بارہ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں دیوان پور ضلع جھنگ جمعے کے روز شیخ فضل محمد کے گھر ایک بچہ جنم لیتا ہے، جس کا بچپن ہی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ آئندہ زندگی میں یہ شعر و ادب کی دنیا کا جگمگاتا ستارہ ثابت ہوگا اور یہ خیال اس وقت حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے کہ جب کچھ ہی عرصہ بعد نہ صرف اردو بلکہ فارسی غزل گوئی میں وہ اپنی مثال آپ بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ تاریخ گوئی میں اس کا ثانی کوئی نہیں اور تحقیقی مضامین اور مقالے اس کی ذہنی استعداد کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ نجی دوستوں کو لکھے گئے خطوط اس کی وسعتِ مطالعہ، کلاسیکی ادب سے دلچسپی اور بہترین یادداشت کا احساس دلاتے ہیں۔ یہ خطوط کسی بھی بلند پایہ علمی مقالے کا نعم البدل ہو سکتے ہیں۔

یہ مرنجاں مرنج، اپنی دھن میں مگن، شہرت و ستائش سے بے پروا حفیظ ہوشیار پوری تھے کہ جنھوں نے تخلّص کے تکلّف سے صرف نظر کرتے ہوئے اپنے اصل نام ہی کو تخلّص کے طور پر برتا۔ حفیظ ہوشیار پوری کا نام شیخ عبدالحفیظ سلیم رکھا گیا۔ سلیم کو تخلّص تصوّر نہ کیا جائے۔ یہ ان کے نام کا حصّہ ہے۔[1] صہیب حفیظ اپنے والد کے خاندانی پس منظر کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ معاشی حالات اچھے نہ تھے۔ دادا شیخ فضل محمد ملازمت پیشہ انسان تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں دیوان پور ضلع جھنگ میں مقیم تھے اور پٹواری کی حیثیت سے اپنی ذمے داریاں نبھارہے تھے۔ رزقِ حلال کے طالب تھے۔ معاشی فارغ البالی کبھی نصیب نہ ہوئی۔[2] یہ وہ زمانہ تھا کہ جب قیامِ پاکستان کے لیے برصغیر کے ہر مسلمان کے دل میں تڑپ تھی اور وہ اس کے حصول کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار تھا۔

حفیظ کا سیاسی و خاندانی پس منظر دیکھا جائے تو ان کے آبا و اجداد سیاست سے عملاً بے تعلّق تھے لیکن تحریک پاکستان کی حمایت سب قرابت داروں نے کی۔[3] حفیظ ابھی صرف نو سال ہی کے تھے کہ والد اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ والد کی وفات کے بعد آپ کی پرورش آپ کے نانا شیخ غلام محمد نے کی۔ شیخ غلام محمد علم و ادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، اردو اور پنجابی زبانوں پر کامل دسترس تھی۔ شعر و ادب سے لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ ان زبانوں کے کئی دیوان حفظ اور نثر کی بے شمار کتابیں ازبر تھیں۔ ان کی علمی و ادبی تربیت نے حفیظ کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کی۔ وہ فرصت کے تمام اوقات اپنے نانا کی معیّت میں گزارتے۔ آپ کے نانا کسی کتاب سے نظم یا نثر کا کوئی ٹکڑا آپ کو سناتے اور اس کی تشریح کرتے۔ شعر اور کتاب سے دلچسپی اسی زمانے کی دین ہے جو رفتہ رفتہ عشق کی صورت اختیار کر گئی۔ ۱۹۳۰ء میں آپ کے نانا کا انتقال ہوگیا۔ گھر کا ماحول علمی اور فضا ادبی تھی، پھر شعر سے محبت حفیظ کی رگ رگ میں اتر چکی تھی، اس سلسلے میں ان کے برادر بزرگ شیخ عبدالرشید خاں راحل صاحب بھی مددگار ثابت ہوئے۔[4]

حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں مسلمانوں کو بہت سی تباہیوں اور بربادیوں کا سامنا رہا۔ ایسی ہی بربادیوں میں حفیظ کا ابتدائی کلام بھی ان کے ہوشیار پور کے خاندانی کتب خانے کے ساتھ ضائع ہوگیا کہ جس میں قدیم ونایاب قلمی وغیر مطبوعہ نسخے بھی شامل تھے۔ حفیظ نے کم عمری ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں کہا گیا یہ شعر غالباً ان کا پہلا شعر ہے۔

پھر نہ دینا مجھے الزامِ محبت دیکھو

تم چلے جاؤ تمھیں دیکھ کے پیار آتا ہے" ۵

۱۹۲۹ء میں اسلامیہ ہائی اسکول ہوشیار پور سے میٹرک اور ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ کالج ہوشیار پور سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ اسی اثنا میں آپ لاہور آگئے اور یہاں آ کر گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۳۳ء میں بی۔اے اور ۱۹۳۶ء میں فلسفے میں ایم۔اے کیا۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے حفیظ کی لاہور آمد۔۔۔ان کے ذوقِ شعروسخن کے لیے مبارک ثابت ہوئی۔ یہاں کی علمی فضا شعرو ادب کے بڑے بڑے ناموں سے گونج رہی تھی۔

حفیظ کی خوش قسمتی کہ انھیں کالج میں صوفی تبسم اور احمد شاہ پطرس جیسے استاد میسر آئے جو طالب علم کی صرف تعلیم ہی نہیں تربیت کی ذمے داری بھی اٹھاتے تھے اور جن کی حوصلہ افزائی اور تعاون شاگرد کے لیے خوش بختی کا زینہ بن جاتا تھا۔ حفیظ کے علاوہ فیض احمد فیض اور ن۔م راشد بھی اسی کالج میں پڑھ رہے تھے۔ اساتذہ میں سیّد احمد شاہ بخاری پطرس، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم بھی تھے جن کے فیض سے ان ہونہار شاگردوں کا شمار پائے کے اہلِ قلم میں ہوا۔ ۶

گورنمنٹ کالج میں آتے ہی حفیظ ہوشیار پوری کی غزل گوئی کی شہرت ہوئی اور پطرس بخاری اور صوفی تبسم کی سرپرستی سے جلد ہی انھوں نے لاہور کی ادبی دنیا میں خود کو تسلیم کروالیا۔ ۷

حفیظ، کتابی آدمی تھے۔ پڑھنے لکھنے کے علاوہ کوئی اور مشغلہ نہ تھا۔ شعروادب سے گہرا تعلق تھا جس کی بنا پر ادبی روابط کا دائرہ بھی وسیع تھا۔ علاّمہ اقبال سے ملاقاتوں کو عمرِ عزیز کے بہترین لمحے قرار دیتے ہیں۔ پطرس، تاثیر، عابد اور صوفی تبسم سے قریبی تعلق تھا۔ ۸ "حفیظ ہوشیار پوری نے شعر گوئی کا آغاز قریب قریب اس زمانے میں کیا جب ہندوستان میں ترقّی پسند مصنفین کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ زمانہء طالب علمی میں انھوں نے آزادیٔ ہند کی تحریک سے متاثر ہوکر چند ایک باغیانہ نظمیں کہی تھیں۔ اس کی پاداش میں وہ پکڑے بھی گئے لیکن پرنسپل کالج کی مدافعت پر معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ نرم گفتاری کی طرف مائل ہوگئے اور ادب برائے ادب کے اس قدر قائل ہوئے کہ انجمن ترقّی پسند مصنفین کے مقابل جب ان کے ہم خیال اہلِ قلم نے "بزمِ افسانہ گویاں" کی طرح ڈالی تو انھوں نے اس کے پہلے جلسے کی صدارت کی اور یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب انھی احباب نے "حلقہء اربابِ ذوق" قائم کی تو اس کے پہلے اجلاس کی صدارت کے فرائض بھی حفیظ ہی نے انجام دیے۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ حلقہء اربابِ ذوق کی تنظیم حفیظ ہوشیار پوری کی صدارت میں قائم ہوئی تھی۔" ۹ ریڈیو میں حفیظ کی ملازمت کا آغاز پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے ہوا اور وہ مختلف ریڈیو اسٹیشنوں اور عہدوں سے ہوتے ہوئے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

"۳۱ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو آپ نے پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے آل انڈیا ریڈیو لاہور میں ملازمت

اختیار کرلی۔ اسی دن کرشن چندر بھی لاہور ہی میں بطور پروگرام اسسٹنٹ متعین ہوئے۔ ۴۳۔۱۹۴۲ء میں حفیظ نے کوئی سال بھر آل انڈیا ریڈیو بمبئی میں بھی کام کیا۔ یہاں آپ کو قدیم اردو اور گجراتی زبان کے تقابلی مطالعے کے مواقع ملتے رہے۔ قیام پاکستان کے وقت لاہور میں تھے۔ کچھ عرصے کے بعد کراچی آگئے اور ریڈیو پاکستان کے مختلف محکمے اور عہدے ان کے سپرد رہے۔ ۴ جنوری ۱۹۶۸ء کو اٹھائیس برس کی ملازمت کے بعد آپ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔''۱۰

ریڈیو پاکستان میں دیگر فرائض منصبی کے علاوہ آپ کے سپرد ایک اہم کام ریڈیو کے لیے مخصوص انداز بیان اور زبان کی نگرانی اور خبروں کے آسان اور بامحاورہ ترجمے کے اصول وضع کرنا تھا۔ چنانچہ آپ کئی سال ریڈیو پاکستان کی لسانی کمیٹی کے صدر رہے۔ ۱۹۵۱ء میں آپ نے نشریات کے لسانی لوازمات خصوصاً خبروں کے ترجمے کے متعلق ایک تحقیقی مقالہ لکھا جو ملک کے مقتدر ادبی رسالوں اور اخباروں نے شائع کیا۔۱۱ حفیظ اپنی حساسیت کی بنا پر اپنے اعلیٰ عہدے اور دیگر دنیاوی آسائشوں کے باوجود اکثر وبیش تر زندگی کے مختلف اوقات میں مختلف عوارض کا شکار رہے۔ زندگی کے آخری ایام میں بھی طویل علالت کی نذر ہوئے۔ اس سے پیش تر بھی انھیں کئی مرتبہ شدید تکلیف کے باعث ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ شمس الدین بٹ صاحب اوراقِ زندگی الٹتے ہوئے کہتے ہیں۔

''میں حفیظ صاحب کے ماتحت ۵۸۔۵۹ اور ۱۹۶۰ء میں رہا۔ میرا ہر روز کا ان سے واسطہ تھا۔ قربت یوں بڑھی کہ ۵۸ء میں ان کی طبیعت خراب ہوئی۔ ریڈیو پر فون آیا کہ حفیظ صاحب علیل ہیں۔ حالت تشویش ناک تھی۔ گھر میں بے ہوش ہوئے اور بے ہوشی کے عالم میں ہسپتال لائے گئے۔ تین ماہ ہسپتال رہے۔ میں ہر روز وہاں جاتا تھا۔ نجی قسم کی ضروریات کے لیے وہ مجھ پر اعتماد کرتے تھے۔ تنخواہ، بل اور بینک وغیرہ کے چھوٹے بڑے کام کر دیا کرتا تھا۔ وہیں حفیظ صاحب سے خاندانی مراسم کا آغاز ہوا۔ حفیظ صاحب کی طبیعت کی طرف سے سبھی کو تشویش تھی۔ ان دنوں جناح ہسپتال کا یہ عالم تھا کہ عام دوا بھی دستیاب نہ ہوتی تھی۔ حفیظ صاحب کے دوست ممتاز حسن بھی اتفاق سے انھی دنوں ہسپتال میں داخل تھے۔ قدرت اللہ شہاب کی بیگم عفت شہاب، بیگم حفیظ کی قریبی عزیزہ تھیں وہ ہر روز آتی تھیں اور حفیظ صاحب کی فائلیں دیکھ کر ان کی حالت سے آگاہ کیا کرتیں۔ ڈاکٹر کرنل رشید اہم مصنف، اسکالر، فلاسفر حفیظ کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ حفیظ صاحب کو پہلے سول ہسپتال میں داخل کروایا گیا۔ ان دنوں رشید صاحب جناح ہسپتال میں ایڈمنسٹریٹر تھے۔ حفیظ جناح ہسپتال جانے سے اس لیے گریز کیا کرتے تھے کہ رشید صاحب دوستی کی وجہ سے رعایت کریں گے۔ ان کا خصوصی خیال رکھیں گے۔''۱۲

زندگی کے آخری ایام میں حفیظ کو سانس کی شدید تکلیف رہی۔ انھیں جو دوا دی جاتی تھی، اس سے سانس چل جاتا تھا، جسم خشک ہونے لگتا۔ حفیظ میں ایک خامی تھی کہ بہت آگاہ آدمی تھے، اپنے مرض کے بارے میں خود جان لیتے تھے۔ ڈاکٹر شوکت

علی سیّد، حفیظ کے معالج اور عقیدت مند تھے۔ حفیظ انھیں کہتے ''شوکت میرا کیا علاج کر رہے ہو۔ اس سے تو میں دو ماہ میں مر جاؤں گا۔'' بسا اوقات تکلیف کی اتنی شدّت ہو جاتی کہ ایک جملہ نہ بول سکتے تھے۔

''ممتاز بزرگ شاعر حفیظ ہوشیار پوری طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون... حفیظ سیدھے سچے آدمی تھے۔ جدید اردو غزل میں ان کا اور اردو شاعری میں ان کی غزل کا مقام یقیناً اس سے بہت زیادہ ہے، جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، لیکن وہ صرف غزل کے شاعر نہیں تھے۔ اردو کے ساتھ فارسی اور شاعری کے ساتھ تحقیق سے بھی انھیں شغف تھا۔ ان کا فکر و فلسفہ کا ذوق بھی ایسا تھا کہ اسے عام ذوق سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا انھوں نے بستر مرگ پر بھی فکر و تحقیق کو نہیں چھوڑا۔'' ۱۳

''دوسرا افسوس جو صرف ہمیں نہیں سارے عالم ادب کو ہے۔ وہ یہ کہ ان کا مجموعہ نہ چھپا۔ کوئی بیس پچیس برس سے اس کا اشتہار آ رہا ہے۔ ''زیرِ لب'' کے نام سے یہ ''نیا ادارہ'' کو چھاپنا تھا۔ غالباً حفیظ صاحب نے مسودہ ہی ان کو نہیں دیا۔ پچھلے دنوں مشتاق احمد یوسفی نے یہ کام اپنے ذمّے لیا اور ہمارے ساتھ مسکوٹ کی کہ حفیظ صاحب کو سرپرائز دی جائے۔ ان کو تب پتا چلے جب کتاب چھپ کر ان کے ہاتھ میں ہو۔ ہم نے کہا یہ دسمبر تک ہونا چاہیے اور ہو سکتا ہے۔ ان کو اس شدنی سے مہلت کی توقع تھی۔ بولے خیر مارچ تک ہو جائے، تو بھی ٹھیک ہے۔ مجموعہ تو چھپے گا لیکن حفیظ صاحب کو سرپرائز نہیں دے سکیں گے۔

ان کے ایفائے عہد تک نہ جیے
زیست نے ہم سے بے وفائی کی'' ۱۴

حفیظ کی پہلی برسی پر ان کے مجموعۂ کلام ''مقامِ غزل'' کی تعارفی تقریب بھی منعقد ہوئی، جس میں حفیظ کے اہلِ خانہ اور عزیز و اقارب کے علاوہ بڑی تعداد میں اہلِ علم و ادب نے بھی شرکت کی۔

حفیظ کی زندگی عشق سے عبارت ہے۔

تمام عمر تیرا انتظار ہم نے کیا
اس انتظار میں کس کس سے پیار ہم نے کیا

اس وقت اس سے بحث مقصود نہیں کہ حفیظ نے کس کس سے پیار کیا۔ البتہ ایک عشق کا تذکرہ یہاں ضروری ہے اور وہ ہے کتابوں سے عشق۔ اس عشق کا تذکرہ بیگم حفیظ بھی کرتی ہیں اور ان کے بچے بھی۔ ان کے دوست احباب بھی اور ان کے دفتر کے ساتھی بھی کہ یہ عشق ایسا تھا کہ چھپائے نہ بنے۔ حفیظ بے لوث و بے غرض انسان تھے، لیکن کتاب سے محبت نے انھیں بے رخی برتنا بھی سکھا دی تھی اور اگر وہ یہ بے رخی اختیار نہ کرتے تو آج ان کی نایاب و نادر کتب نہ جانے کن کن احباب کے گوداموں میں پڑی ہوتیں یا ان کے مطالعے کے کمرے کی زینت ہوتیں۔

''کئی صد تک کتابیں تھیں جنھیں بڑی احتیاط سے رکھتے تھے۔ مجھے ان کی رہائش گاہ (انٹیلی جنس سکول) میں کئی بار ان کی لائبریری دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک بار ان کی لائبریری سے دو چار کتابیں عاریتاً مانگنے کا اتفاق ہوا، لیکن وہ کسی کو اپنی کتابیں عاریتاً بھی نہیں دیتے تھے۔'' ۱۵

حفیظ اگر عاریتاً بھی کسی کو اپنی کتابیں نہ دیتے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی اس محنت اور جستجو کو ضائع ہوتے نہ دیکھ

سکتے تھے جو انھیں کتاب کی تلاش اور کرید کے سلسلے میں کرنی پڑی تھی۔اس کا اندازہ اس خط سے بھی لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے اپنے دوست پیر حسام الدین راشدی کے نام لندن سے لکھا تھا۔حفیظ لکھتے ہیں۔

''...مجھے HOBSON JOBSON اور ELLIOT کے بعض حصّوں کی بڑی ضرورت تھی۔ تلاش کیا HOBSON JOBSON دو جگہ نظر آئی ایک نے 5.5 پونڈ دوسرے نے 4.5 پونڈ مانگے۔ میں نے کئی دنوں کے بعد دوسرے سے جا کر لی۔ ELLIOT کی چوتھی جلد میرے پاس ہے۔خیال تھا کہ پہلی تین مل جائیں تو کم سے کم چار جلدیں مکمل ہو جائیں۔ تیسری جلد تو نہیں مل سکی۔البتہ پہلی دو جلدیں دو مختلف دکانوں سے ملیں ایک نے تین پونڈ لیے۔ دوسرے نے 3.5 پونڈ۔معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے پرانی کتابوں کے تاجروں نے ان لوگوں کے دماغ خراب کردیے ہیں۔''۶؎

''پاکستان بنے ابھی ایک آدھ سال ہی گزرا ہوگا کہ کئی ایک نامی شاعر، مشاہیر، اہل قلم اور نامور ادیب ہندوستان تیاگ کر یہاں پہنچ گئے۔ مولانا عبدالحق اپنے رفقاء کیفی صاحب اور سیّد ہاشمی کے ساتھ پہنچ گئے تھے۔ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی تشریف لے آئے اور ان کا تعلق بھی انجمن سے ہو گیا تھا۔صبح و شام کی اکثر و بیشتر مجلسیں مولوی صاحب کے ہاں ہوا کرتی تھیں،لیکن رات کی محفل گئی رات تک قاضی صاحب کے ہاں لازمی ہو گئی تھی۔ بلا ناغہ آنے والوں میں چار ایسے دوست تھے جنھیں اس زمانے میں ''اخوان الصفا'' کہا جاتا تھا۔ ایک یہ نیاز مند، قاضی صاحب، حفیظ ہوشیار پوری اور ممتاز حسن اس اخوان الصفا کے چار رکن تھے۔''۷؎

حفیظ صاحب کو ان کے اصل رنگ میں دیکھنا ہو تو بے تکلف دوستوں کی محفل میں دیکھیے، جہاں وہ ایک ذمہ دار افسر یا معتبر شاعر یا سنجیدہ شخصیت کے بجائے کسی اور ہی روپ میں نظر آتے ہیں۔ان کی بدیہہ گوئی بہت مشہور ہے۔معمولی باتوں کی تاریخ نکالنا ان کے کمپیوٹر ذہن کے لیے کچھ دشوار نہ تھا۔ اسی طرح بدیہہ گوئی میں بھی یکتا تھے۔ باتوں باتوں میں رواں ہو جاتے۔وہی انداز گفتگو جو عموماً بہت دھیما اور نرمی و شائستگی سے بھرپور ہوتا، دوستوں کی محفل میں یکسر بدل جاتا۔شوخی و شگفتگی کی انتہا ہو جاتی۔

حفیظ کی نظم گوئی کے متعلق کہا جاتا ہے: قابل لحاظ نہیں۔۸؎لیکن اگر حفیظ اُن کی نظم گوئی کا جائزہ بمقدار و معیار لیا جائے تو وہ اتنی کم وقعت نہیں کہ اسے نظر انداز کیا جاسکے۔بے شک حفیظ غزل کے شاعر ہیں،غزل کی تازگی اور تنوع میں حفیظ کا مقام معتبر ہے لیکن ان کی نظموں سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔''مقامِ غزل'' میں شامل نظموں کی تعداد نو ہے۔اس بات کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا:

''حفیظ ہوشیار پوری یقیناً اعلیٰ معیار کے شاعر تھے۔مجھے دکھ ہے کہ ان کی موت کے بعد ان کا جو مجموعہ شائع ہوا وہ ان کی آدھی نمائندگی بھی نہیں کرتا۔''۹؎حفیظ غزل کی روایت کے شاعر ہیں۔انھوں نے غزل کی اس روایت کو جس کا آغاز اصغر و فانی، جگر و یاس اور فراق نے نہایت نامساعد حالات میں کیا تھا، آگے بڑھایا اور غزل کو وہ تیور عطا کیے جو ان کی غزل کی شناخت قرار پائے اور شاعری کی اہم ترین صنف سخن غزل میں وہ معتبر ٹھہرے۔دوسری جانب اردو شاعری کی ایک اور صنف جو رفتہ رفتہ ماضی کا حصہ بنتی جا رہی ہے یعنی ''تاریخ گوئی'' میں بھی حفیظ درجۂ کمال پر فائز رہے۔آج کا دور مشینی دور ہے۔سہل پسند انسان سہولت

اور آسائش کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ بغیر اضافی ذہنی وجسمانی مشقت کے اسے ہر قسم کا آرام چاہیے اور یہیں سے کج روی کی ابتدا ہوتی ہے۔ حفیظ بھی اسی عہد سے تعلق رکھتے تھے، لیکن وہ کیوں اپنے ساتھیوں سے مختلف تھے، اس لیے کہ ابھی دنیا کا وجود باقی ہے اور جب تک قیامت برپا نہیں ہوجاتی، آدمیوں کے ازدحام میں خال خال، ہی سہی، انسان نظر آتے رہیں گے۔ حفیظ محنتی انسان تھے۔ ان کی محنت پسند طبیعت نے تاریخ گوئی جیسے مشکل فن کو بھی پانی کر ڈالا تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے کسی بات سے، کسی بھی مصرعے سے، کسی بھی فقرے سے تاریخ نکال لیا کرتے تھے۔ بات کرتے کرتے ایک دم کہہ اٹھتے کہ لو بھئی اس فقرے سے تو تاریخ نکل آئی۔ اردو شاعری کی تاریخ میں ایسے کتنے نام ہوں گے اور آج عہد حاضر میں تو شاید انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ ان کے معاصرین اور قریبی دوست جہاں حفیظ کی غزل کی پختہ کاری کا تذکرہ کرتے ہیں وہیں ان کے ایک نابغہء روزگار تاریخ گو ہونے کا ذکر کرنا نہیں بھولتے۔ انھوں نے بے شمار تاریخیں کہی ہیں۔ گھریلو بات چیت ہو، معمولی واقعات رونما ہوں یا قومی وملی سانحات وواقعات، ان کی تاریخ کہہ لینا ان کے لیے کوئی مشکل بات نہ تھی جبکہ دوسروں کے لیے یہ ایک حیران کن بلکہ ناممکن مرحلہ تھا۔ ایک مرتبہ اس سوال کے جواب میں کہ آپ تاریخ گوئی میں کن کن چیزوں کو مدنظر رکھتے ہیں؟ حفیظ صاحب نے فرمایا:

> ''فن تاریخ گوئی، فن شعر سے بالکل ایک الگ فن ہے۔ کسی تاریخ گو کے لیے شاعر ہونا یا کسی شاعر کے لیے تاریخ گو ہونا ضروری نہیں۔ تاریخ گوئی میں، میں جن جن باتوں سے احتراز کرتا ہوں وہ ان پرانے شعراء کا ورثہ ہیں جو اتفاق سے تاریخ گو بھی تھے اور شاعر بھی۔ ان میں سے اکثر یہ کوشش کرتے تھے کہ کوئی ایسا مصرع سوجھ جائے جس کے اعداد کسی خاص سن کے برابر ہوں۔ خواہ اس کا تعلق اس واقعہ سے ہو یا نہ ہو۔ جس کا اظہار تاریخ میں مقصود ہے۔ تاریخ کے لیے ایک پورے مصرعے کی دھن میں اساتذہ اصل واقعہ کی نوعیت وخصوصیت کو نظر انداز کر دیتے تھے، چنانچہ ایسے مصرعے تاریخ میں موجود ہیں جو ایک ہی سال میں کئی واقعات یا کئی مرنے والوں پر چسپاں کیے جاسکتے ہیں۔ میں یہ کوشش کرتا ہوں کہ کسی واقعے یا حادثے کے متعلق ایسے موزوں الفاظ مل جائیں جو اس سال پیش آنے والے دیگر واقعات پر منطبق نہ ہوسکیں اور جن کے اعداد بھی اس سال کے مطابق ہوں۔ اس کے بعد مادہ تاریخ ذہن میں آجائے۔ اگر مادہ تاریخ میں موزونیت ہو تو وہ خود بخود کسی شعر میں سما جاتا ہے۔ ورنہ میں اسے جوں کا توں رہنے دیتا ہوں۔''[20]

حفیظ صاحب خود بھی اس فن کی مشکلات سے آگاہ تھے اور اس بات کا بھی احساس رکھتے تھے کہ اس برق رفتار زمانے میں اس فن کی کچھ قدر وقیمت باقی نہیں رہ گئی ہے، جس کا تذکرہ وہ دورانِ گفتگو بھی کرتے رہتے تھے:

> ''ایک دو سال قبل کی بات ہے کہ ہمارے دفتر کے ایک مخلص ساتھی کا انتقال ہوا۔ ان کے بارے میں تعزیتی نوٹ میں نے رسالہ ''آہنگ'' میں چھپنے کے لیے لکھا اور حفیظ صاحب سے درخواست کی کہ وہ اس سانحے پر تاریخ کہیں۔ مرحوم نے بکمال شفقت فرمایا۔ محشر، اب اس فن کی کوئی قدر نہیں ہے۔ اس کے لیے محنت کرنا رائگاں ہے۔ تم بھی اس الجھن میں نہ پڑا کرو۔ ان کلمات سے مجھے اپنے والد

مرحوم کی ایک ہدایت یاد آئی۔ انھوں نے ایک اخبار میں میری تاریخ دیکھی، جسے بہت پسند کیا لیکن ساتھ ہی فرمایا ''اس اذیت میں اپنے آپ کو نہ ڈالا کرو۔ تاریخ گوئی بڑی ذہنی کاوش طلب کرتی ہے اس میں اکثر راتوں کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں۔'' [۲۱]

''حیاتِ اقبال میں لکھا ہے کہ آج تک کسی شخص کی وفات پر اتنی زیادہ تاریخیں نہیں کہی گئیں۔ مثلاً جناب حفیظ ہوشیار پوری نے کئی کئی تاریخیں نکالی ہیں، جن میں ''ڈاکٹر سر محمد اقبال'' اور ''آہ مفکر اعظم'' سے ان کی وفات کی ہجری تاریخ ۱۳۵۷ھ نکلتی ہے اور ''پیغمبر دین خودی'' کے عدد ۱۹۳۸ء بنتے ہیں۔ حفیظ صاحب نے علامہ اقبال کے ایک مصرع ''صدق و اخلاص و صفا باقی نماند'' سے بھی ہجری تاریخ نکالی۔ راحل ہوشیار پوری نے ''خضرِ راہ اسلام'' سے عیسوی تاریخ نکالی۔'' [۲۲]

حفیظ اگر شاعر نہ بھی ہوتے تو ان کے تخلیقی و تحقیقی مضامین جو بذاتِ خود تخلیق کا درجہ رکھتے ہیں اردو ادب میں انھیں حیاتِ دوام عطا کرنے کے لیے کافی تھے۔ بہر حال یہ بات نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ شعر عوام الناس کو جلد متوجہ کرتے ہیں اور یہاں بھی یہی ہوا۔ لوگ حفیظ کی غزل کے سحر میں ایسے گرفتار ہوئے کہ ان کے تحقیقی کارناموں کی طرف وہ توجہ نہ دی گئی کہ جس کے وہ مستحق تھے۔ تحقیق کا میدانِ خارزار جس حوصلے، کاوش اور محنت کا تقاضا کرتا ہے اسے عبور کرنا ہر ایک کے لیے ممکن نہیں۔ تحقیقی کام وقت طلب ہی نہیں وقت طلب مشغلہ بھی ہے۔ اسے اپنانا ہر ایک کے بس میں نہیں۔ ایک تحقیقی مقالہ قلم بند کرتے ہوئے حوالے کے لیے جن نادر و نایاب کتب کی ضرورت پڑتی ہے، ان تک رسائی ایسے ماحول میں ممکن نہیں کہ جہاں لائبریری کی ضرورت و اہمیت ابھی تک واضح نہیں ہو سکی ہے اور جہاں بوقت ضرورت ایک عام کتاب بھی عدم دستیابی کی صورت میں محقق کو پریشان کر سکتی ہے، وہاں کسی نایاب و قدیم مطلوبہ کتاب کا حصول ایک بڑا مسئلہ بن جاتا ہے۔ مسائل کا حل صرف شوق ہی سے ممکن ہے جو راہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو دور کرتا چلا جاتا ہے۔

حفیظ محنتی تھے، مشکلات پر قابو پانا جانتے تھے۔ مطالعے کے شوقین تھے۔ نادر و نایاب کتب کے حصول کے لیے وقت بھی نکال لیتے تھے اور اپنی تنخواہ کا ایک حصہ بھی صرف کر لیتے تھے۔ اس سلسلے میں سفر کو بھی مشکل نہ جانتے تھے۔ حفیظ کا وسیع مطالعہ اور مختلف زبانوں سے دلچسپی اور ان پر عبور ان مضامین سے عیاں ہے۔ اردو، فارسی، انگریزی، سندھی اور پنجابی زبان و ادب کے مطالعے نے ان کے ذہن کو وسعت اور شعور کو جلا بخشی۔ نجی دوستوں کو لکھے گئے خطوط بھی ان کی وسعتِ مطالعہ، کلاسیکی ادب سے دل چسپی اور بہترین یادداشت کا احساس دلاتے ہیں۔ یہ خطوط کسی بھی بلند پایہ علمی مقالے کا نعم البدل ہو سکتے ہیں۔ حفیظ بے انتہا مصروفیت کے باوجود خط لکھنے کے شائق تھے اور فاصلوں کو قلم کے ذریعے دور کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ ان کے منظوم و منثور خط پڑھنے والوں کے لیے ادبی و علمی معلومات کا ایک بیش بہا خزینہ لیے ہوئے ہیں۔ ذوقِ تحقیق اور شوقِ جستجو ایک ایک سطر سے عیاں ہے۔ بظاہر موضوعات خشک دکھائی دیتے ہیں لیکن داستانی رنگ میں ڈھلے ہوئے خطوط مکتوب الیہ کو علم کے ساتھ ساتھ حظ عطا کرتے ہیں۔ صلاح الدین ۔۔۔ حفیظ کے قریبی دوستوں میں سے ایک، دونوں کے شوق مشترک، نایاب کتابوں کی تلاش اور وسعتِ مطالعہ قدرِ مشترک۔ شیخ صلاح الدین نے حفیظ کے انتقال کے بعد ان کا لکھا ہوا ایک طویل خط صہیب حفیظ کو عطا کیا جو اس وقت میرے پیش نظر ہے۔ اور میں مطالعے کی غرض سے پیش کر رہی ہوں۔

حفیظ کا ایک نایاب خط

ڈائریکٹوریٹ جنرل، ریڈیو پاکستان

۱۷۔گارڈن روڈ کراچی

۲۰راگست ۱۹۵۳ء

صلاح الدین![1]

جب کوئی بیرنگ خط آتا ہے تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ اڈیٹر نے مضمون یا غزل کی فرمائش کی ہے۔رجسٹرڈ خط میں عام طور پر کسی اجنبی کی طرف سے ''قطعہ تاریخ'' کی ''درخواست ہوتی ہے۔''رسید طلب'' رجسٹرڈ خط اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ کسی کتاب فروش نے ''بل'' ادا کرنے کا تقاضا کیا ہے۔

۱۲راگست کو ڈاکیے نے پہلے ایک رسید پر دستخط کرائے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ خط لکھنے والے کو ڈاک خانے کے انتظامات پر اعتماد نہیں جب اس نے دوسری رسید پیش کی تو میں نے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھا...گویا ''مکتوب الیہ'' بھی ناقابلِ اعتبار ہے۔ آخر میں اس نے لفافہ میرے ہاتھ میں دیا۔کونے میں تمہارا نام پڑھ کر ''ندامت آمیز'' اطمینان ہوا۔اطمینان اس لیے کہ پہل کا سہرا تمہارے سر رہا اور ''ندامت اپنی طویل خاموشی پر۔

جس ''کتابچے'' کا تم نے ذکر کیا ہے اس کا مقصد تمہاری معلومات میں اضافہ کرنا نہیں تھا۔ یہ ایک طریقہ تھا طویل خط کی ''زحمت'' کو ملتوی کرنے کا...ایک سطر کا خط لکھنے سے نہ تمہیں تسلی ہوتی نہ میرے دل کی بھڑاس نکلتی۔۔اس لیے مناسب ہی سمجھا کہ کسی کتاب پر ایک سطر لکھ کر تمہیں اپنے کراچی پہنچنے کی رسید بھیج دوں گا۔اب رہی یہ بات کہ اس کتاب پر میری کیوں نظر پڑی؟اس کی وجہ بھی سن لو۔

۱۔ میرے دوست کی تصنیف ہے۔

۲۔ ''سندھی ادب'' پر اردو میں پہلی کتاب ہے۔

۳۔ اس سلسلے میں ''پنجابی ادب'' پر جو کتاب چھپی ہے، یہ اس سے بہتر ہے۔[2]

تمہارا خط لکھنے کا مشغلہ میرے لیے باعثِ رشک ہے۔ خدا کرے کہ یہ سلسلہ جاری رہے، یہاں تک کہ وہ ''امریکائی'' خاتون جسے بڑھاپے میں اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا ہے، بالکل مطمئن ہو جائے۔میرا خیال ہے کہ اگر پاکستان میں ایسے خط لکھنے والے تمہاری طرح بہت سے لوگ پیدا ہو جائیں تو آئے دن دوسرے ملکوں میں ''ثقافتی مشن'' بھیجنے کی ضرورت نہ رہے، جی چاہتا ہے کہ اس ''جرمن دوشیزہ'' اور اطالوی نوجوان'' کے پتے بھی تمہیں بھیج دوں جس سے میں تہران میں خط لکھنے کا وعدہ کرکے آیا تھا''جرمن'' اور اطالوی'' ان کی مادری زبانیں ہیں لیکن یہ انگریزی بولتے اور فارسی پڑھتے ہیں۔

''فاتح انور'' یعنی ''غالب''[3] کا ذکر کیا ہے تو ان میاں بیوی کے متعلق بھی کچھ سن لو۔ ان کے ''نکاح'' (''عشق'' نہیں) کی تاریخیں یہ ہیں:

''غالب وانور آسودہ'' (۱۳۷۲ھ)

''نکاحِ غالب با انور'' (۱۹۷۲ھ) ان دونوں سے کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی ہے۔انور کا شغل یہ ہے ''کلفٹن'' پر جا کر

''سیپیاں'' چننا اور ان کو اپنے شوق مصوری کا تختہء مشق بنانا۔ یہ سیپیاں میں نے دیکھیں جن پر بڑی خوبصورت مصوری کی گئی تھی اور غالب کا شغل یہ ہے کبھی کبھی انور کے ساتھ کافی ہاؤس آنا...''

اس طویل جملہء معترضہ کے بعد دوسری کتاب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں یعنی ''رباعیات خیام'' ''بخط میر'' جو تمہیں دوسری مرتبہ بھیجی گئی۔ میں خوش ہوں کہ ''کتاب کا انتخاب'' تمہیں پسند آیا ''عمر خیام'' کی رباعیات کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ [۴]

لیکن اس کتاب کی اہمیت ''عمر خیام'' کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے کاتب ''میر عماد'' [۵] کے باعث ہے بعض لوگوں کو تو اس میں بھی شبہ ہے کہ یہ ''رباعیات'' عمر خیام کی ہیں؟ یہ رباعیاں جو اس کتاب میں چھپی ہیں آج سے چار سو سال پہلے ایران کے مشہور خطاط ''میر عماد'' نے اپنے قلم سے لکھیں، اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ایران کے ''کتب خانہء ملی'' میں [۶] موجود ہے۔

''انجمنِ دوستدارانِ کتاب تہران'' [۷] کا کمال یہ کہ اب سے چار سو برس پہلے لکھے ہوئے نسخے کا عکس لے کر نہایت خوب صورتی سے شائع کیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے آج کسی نے لکھی ہیں اصلی نسخے کا حسن بھی برقرار رہا اور اس میں جدید فن طباعت کی خوبصورتی بھی شامل ہو گئی...

''کاش ہمارے یہاں بھی ایسی خوبصورت کتابیں چھاپنے کا رواج ہو جائے۔''

''خیام'' کی ان رباعیوں کے کاتب میر عماد کی زندگی کے حالات بیک وقت اس قدر ''دلچسپ'' اور ''دردناک'' ہیں کہ میں ان کا ذکر کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔

میر عماد دسویں صدی ہجری کے نصف آخر میں بہ مقام قزوین [۸] پیدا ہوا۔ بچپن ہی سے خوش نویسی کا شوق تھا۔ جب اسے اپنے فن کے متعلق اعتماد پیدا ہو گیا تو اس نے تبریز [۹] کا رخ کیا اس وقت محمد حسین تبریزی [۱۰] ایران کا بہت بڑا خطاط تھا۔ میر عماد تبریز پہنچتے ہی محمد حسین کا شاگرد ہو گیا۔ ایک روز نہایت خوبصورت ''قطعہ'' لے کر استاد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ استاد نے دیکھ کر کہا۔ ''اگر تو بھی اس قسم کا قطعہ لکھ سکتا ہے تو لکھ... ورنہ قلم توڑ دے۔'' عماد نے جواب دیا۔ ''حضور یہ اسی خاکسار کا لکھا ہوا ہے۔'' اس پر استاد نے پہلے ''قطعہ'' کو بوسہ دیا، پھر شاگرد کا منہ چوما اور کہا ''تو خوش نویسوں کا استاد ہے۔''

یہاں سے میر عماد کی شہرت شروع ہوئی، اصفہان [۱۱] میں شاہ عباس صفوی [۱۲] حکمران۔ اس کے زیر سایہ علم و فضل کی بڑی قدر ہو رہی تھی۔ دور دور سے فنکار جمع ہو رہے تھے اس زمانے میں مینا تور [۱۳] کاشی کاری [۱۴] کتاب نویسی، جلد سازی، قالین بافی اور دوسرے فنون نے بہت ترقی کی۔ میر عماد بھی گیارہویں صدی ہجری کے شروع میں اصفہان پہنچا۔ اصفہان پہنچ کر اس نے بادشاہ کو جو خط لکھا وہ تہران کے کتب خانہء ملی میں اب تک محفوظ ہے۔

بادشاہ نے بڑی آؤ بھگت کی۔ بہت سے خطاط اس کے شاگرد ہو گئے۔ ان میں ''درباری'' اور شہزادے بھی شامل تھے۔ شعرانے اس کے خط کی تعریف میں قصیدے لکھے۔ اس زمانے کے ایک شاعر میر عبدالغنی تفرشی [۱۵] نے یہ رباعی کہی۔

تا کلک تو در نوشتن اعجاز نماست
بر معنی اگر لفظ کند ناز رواست
ہر دائرہ ترا فلک حلقہ بگوش
ہر مد تُرا مدتِ ایام بہاست

میر عماد خود شاعر تھا۔ ہوتے ہوتے اسے اپنے رتبے کا احساس ہونے لگا اور تم جانتے ہو زندگی میں یہ مرحلہ انسان کے لیے بڑا سخت ثابت ہوتا ہے۔ (اور میر عماد کے لیے سخت ثابت ہوا) چنانچہ اس نے اپنی تعریف میں یہ رباعی کہی۔

الا اے بے نظیر خطہ ء خط
کسے نوشتہ از تو در جہان بہ
چو از کلک ِ تو گردد دال مرقوم
زہر دو زلف و قدِ دلبراں بہ

نتیجہ بہت سے حاسد پیدا ہو گئے۔ اس کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنے لگے۔ بادشاہ دربار کے ایک اور خطاط علی رضا عباسی ۱۶ کی طرف زیادہ توجہ کرنے لگا آخر میر عماد نے تنگ آ کر کہا۔

از من بگیر عبرت کسب و ہنر مکن
از خویشتن عداوت ہفت آسماں مخواہ

بادشاہ کے دل میں رنجیدگی پیدا ہو جانے کے باوجود میر عماد بہت مقبول تھا۔ اس میں کچھ اس کے اخلاق کو بھی دخل تھا۔ اس کے شاگردوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی۔ ایک شاگرد ابوتراب اصفہانی ۱۷ نے ایک دلچسپ قصہ بیان کیا ہے۔ ابوتراب اصفہان کے ایک قہوہ خانے میں بیٹھا تھا۔ میر عماد اپنے بھانجے اور شاگرد عبدالرشید دیلمی ۱۸ کے ساتھ قہوہ خانے کے سامنے سے گذرا۔ ابوتراب نے دل میں سوچا کہ اگر میر عماد خوش اخلاق آدمی ہے تو ضرور لوٹ کر قہوہ خانے میں آئے گا اتنے میں وہ کیا دیکھتا ہے کہ میر عماد چند قدم چلنے کے بعد سچ مچ لوٹ کر قہوہ خانے کی طرف آ رہا ہے۔ قہوہ خانے میں آیا۔ قہوہ پیا اور پیتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور یہ فقرہ کہہ کر قہوہ خانے سے چلا گیا "یہ سب کچھ تو ہمارے گھر میں بھی موجود ہے۔" ابوتراب اشارہ سمجھ گیا اور دوسرے دن میر عماد کے گھر گیا اور بالا خانے میں مقیم ہو گیا۔ ابوتراب کا بیان ہے کہ اس کے بعد میں نے بارہ برس تک میر عماد کے گھر کے باہر قدم نہیں رکھا۔

ایک مرتبہ شاہ عباس نے ستر تومان (ہمارے موجودہ ۳۵ روپے کے برابر) ایک آدمی کے ہاتھ بھیجے اور حکم دیا کہ فردوسی کا شاہنامہ لکھو، یہ اس کی پیشگی اجرت ہے۔ سال بھر گذر جانے کے بعد بادشاہ نے یاددہانی کے لیے آدمی بھیجا۔ میر عماد نے شاہ نامہ کے پہلے ستر شعر جو لکھ رکھے تھے، بھیج دیے اور ساتھ ہی کہلا بھیجا۔ "سرکار نے جو رقم بھیجی تھی اس میں یہی کچھ ہو سکتا تھا۔" بادشاہ نے شعر واپس بھیج دیے۔ میر عماد نے شعروں کو قینچی سے الگ الگ کاٹا اور ایک ایک شعر اپنے ستر شاگردوں کو دے دیا اور ہر شاگرد سے ایک ایک تومان وصول کیا۔ اس طرح ستر تومان جمع کر کے اس نے بادشاہ کو بھیج دیے۔ بادشاہ جل کر آگ بگولہ ہو گیا اور حاسد پہلے ہی اس کے کان بھر چکے تھے۔

ایک دن بھری محفل میں بادشاہ کے منہ سے یہ فقرہ نکل گیا۔

"کوئی نہیں جو اس سنی (یعنی عماد) سے مجھے نجات دلائے۔"

چند روز بعد میر عماد کی لاش سڑک پر پائی گئی۔ قزوین کے ایک قبائلی سردار مقصود بیگ نے اسے رات کو اپنے ہاں کھانے پر بلایا تھا اور ساتھ ہی چند اوباشوں سے مل کر یہ سازش کر رکھی تھی کہ راستے میں اسے قتل کر دیا جائے۔ کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی کہ

راستے سے اس کی لاش اٹھائے۔ آخر اس کے شاگرد ابوتراب نے یہ خدمت اپنے ذمے لی۔ بادشاہ کے حکم کے ماتحت شان و شوکت سے جنازہ اٹھا۔ امرا، وزرا اور شہزادوں نے شرکت کی۔ اصفہان میں ایک مسجد ''مسجد مقصود بیگ کے'' نام سے مشہور ہے اس میں دفن کیا گیا۔ سنا ہے یہاں اب تک میر عماد کی قبر کا نشان باقی ہے۔ (افسوس کہ اصفہان کے مختصر قیام میں ہم یہاں نہ جا سکے)

یہ مقصود بیگ جس کے نام سے اصفہان کی مسجد منسوب ہے شاہ عباس صفوی کا وزیر تھا اور اس مقصود بیگ کا ہم نام جس نے عماد کو قتل کرایا۔ عجیب اتفاق ہے۔

والہ داغستانی ۱۹ نے اپنی غیر مطبوعہ کتاب ''ریاض الشعرا'' میں میر عماد کے قتل کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فارسی کا یہ مشہور شعر نقل کیا ہے، جس میں صفوی کی طرف اشارہ ہے۔

خوش آنکہ شب کشی و روز آئیم برسرے
کہ آہ ایں چہ کس است و کہ کشتہ است او را

(بڑا مزہ آئے اگر تو خود ہی مجھے رات کو قتل کرے اور خود ہی صبح کو لاش کے پاس آ کر پوچھے ''یہ بیچارا کون ہے اور اسے کس نے مارا ہے؟'')

میر عماد کے قتل پر ایران و ہندوستان میں صفِ ماتم بچھ گئی شعرا نے مرثیے لکھے جن میں سب سے مشہور اس کے شاگرد ابو تراب اصفہانی کا مرثیہ ہے۔ سنا ہے کہ ابوتراب نے میر عماد کی قبر کے لیے ایک پتھر بھی تیار کرایا تھا جو بالآخر خود اس کی قبر کے کام آیا۔

ہندوستان میں میر کے قتل کی خبر پہنچی تو جہانگیر نے ''مجلسِ عزا'' منعقد کی اور کہا ''اگر میر عماد یہاں آ جاتا تو میں اس کے وزن کے برابر اسے جواہرات دیتا'' ۲۰ اس واقعے کے بعد میر عماد کا بھانجا اور شاگرد، عبدالرشید دیلمی ہندوستان چلا آیا اور یہاں اس نے بڑا نام پیدا کیا۔ میر عماد کی لکھی ہوئی کتابیں رام پور کی لائبریری میں بھی موجود ہیں۔ انگلستان، جرمنی اور فرانس کے مستشرقین نے اپنی کتابوں میں اس کا ذکر کیا ہے۔

مختصر یہ کہ میر عماد سے دو سو برس پہلے اور اس کے چار سو برس بعد اب تک نستعلیق میں ایسا استاد پیدا نہیں ہوا۔

کتنی دلچسپ اور دردناک تھی اس کی زندگی اور کس کس ذوق اور شوق سے اہلِ ایران نے اس کی خطاطی کو زندہ کیا ہے۔

لذیذ بود حکایت، درازتر گفتم

اس سے پہلے کہ تم اکتا جاؤ میں اور موضوعات کی طرف آتا ہوں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اگر ہماری ملاقات ہوتی اور تم مجھ سے اس کتاب کا ذکر سنتے تو میں یہ سارا قصہ اس صورت میں بھی سناتا۔ فرق صرف یہ ہوتا کہ زبانی گفتگو کے دوران میں چار زبانوں میں بات کرنی پڑتی۔ اردو، پنجابی، انگریزی، فارسی۔ بہر حال میں نے یہ ساری باتیں کہہ ڈالیں کہ میں نہ صرف محسوس کر رہا ہوں کہ تم میرے پاس بیٹھے ہو بلکہ دیکھ رہا ہوں کہ تم میرے پاس بیٹھے ہو۔ نہ صرف تم بلکہ اور دوست بھی۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ انتظار حسین ۲۱ چپ چاپ ہمارے پاس بیٹھا ہے۔ ہاں جب تم نور عالم ۲۲ کا نام لیتے ہو تو اس کی بے نور آنکھوں میں عارضی طور پر چمک آ جاتی ہے۔ انور جلال ۲۳ abstact art پر ''لیکچر'' دے رہا ہے اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ ہم سب اس کی باتیں سمجھ رہے ہیں۔ ناصر ۲۴ کوئی ایک گھنٹہ ہوا یہ کہہ کر اٹھا تھا کہ ابھی دو منٹ میں واپس آتا ہوں۔ اتنے میں ایک گول مٹول سی، پیاری سی چیز ہماری طرف بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے جیسے کوئی سر کے بل چل کر آ رہا ہو۔ اور دو منٹ

میں سلیم شاہد ۲۵ میرے پاس آ کر بیٹھ جاتا ہے۔''ھی صاحب اج پتہ ای نہیں لگا۔ کس ویلے آ گئے سی۔ اک کاغذ تھواڈے کمرے چے...'' تمھارے کانوں میں ''حسب معمول'' یہ سرگوشی پہنچ جاتی ہے اور تمہاری بروقت ''دخل اندازی سے'' یہ ''دکاندارانہ گفتگو'' شروع ہونے سے پہلے بند ہو جاتی ہے اور تھوڑی دیر بعد میں یہ کہہ کر کہ ۸ بجنے کو ہیں، مجھے دفتر جانا ہے۔ تمھارا اشارہ پا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور سیدھا گھر کا رخ کرتا ہوں۔

۲۶/ اگست ۱۹۵۳ء

۱۳۳/ اعلیٰ جنس سکول، کوئین روڈ

میرے دوست، دوستی خود دوستی کا انعام ہے۔ اس کے لیے اظہار کی ضرورت نہیں اور وہ بھی کسی کی آڑ لے کر۔ زیر بحث کتاب بھیجنے سے مقصود ''اظہار دوستی'' نہ تھا اور نہ اس کے لیے میں نے کسی کی آڑ لی، البتہ اب مجھے محسوس ہوا یہ کتاب ڈاک کے ذریعے بھیجنی چاہیے تھی۔ یہ احساس پیدا کرنے کے لیے شکریہ...

''صنفِ نازک''، ''صنفِ ضعیف''، ''نصف بہتر'' اور ''عورت ذات'' عورت کی اصلی حقیقت ان ''خطابات'' میں کھو کر رہ گئی ہے، جو مردوں نے اپنی کمزوریوں کو چھپانے یا اجاگر کرنے کے لیے عورت کو عطا کیے ہیں۔ ان ''خطابات'' میں کہیں تو عورت کا ''تفوق'' ظاہر کیا گیا ہے (اور وہ بھی محض جذبات کی بنا پر) اور کہیں اس کی مظلومیت کی تصویر کھینچی گئی ہے اور حقیقت ان ''خطابات'' سے بالا تر ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ عورت پر اس دنیا میں وہی گزری جو ''تصوف'' پر اور ہماری مشہور صنفِ شعر ''غزل'' پر۔ جس طرح تصوف پر ''کرامات'' اور ''اصلاحات'' کے پردے ڈالے گئے اور جس طرح ''غزل'' کو چند مضامین میں محصور کر دیا گیا، یہاں تک کہ ''عاشق'' اور ''معشوق'' کی تفریق کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی صفات بھی ہمیشہ کے لیے مقرر کر دی گئیں۔ اسی طرح عورت کے اصلی وقار پر ان ''نظریوں'' کے پردے ڈال دیے گئے جن کا تانا بانا مردوں کے ''دماغ'' میں تیار ہوا۔ اس سادہ اور آسان بات کو کوئی نہ سمجھا کہ ''مرد و زن'' زندگی کے سفر میں ایک دوسرے کے دوش بدوش گامزن ہیں۔

جب صورتِ حال یہ ہو تو کسی ''صنفِ بشر'' عورت یا مرد سے حجاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ حجاب کسی ''انسان'' سے ہو سکتا ہے خواہ وہ ''عورت ہو یا مرد''۔ ایک ایسے انسان سے جو دوسرے کی افتادِ طبع، ذہنی نشو و نما اور قلبی کیفیات کے مطابق نہ ہو۔

میں اس سے متفق نہیں کہ ''شعری'' یا ''فنی'' تخلیق کیلئے کسی انسان (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) کی ہم نشینی ضروری ہے نہ یہ تجربے سے ثابت ہے نہ تاریخ ادب کا مطالعہ قطعی طور پر اس نظریے کے حق میں ہے اور نہ ''تنقیدِ ادب'' کا کوئی نظریہ اسے لازم قرار دیتا ہے، کسی کے متعلق یہ کہنا کہ اس کے کلام میں ''گرمی'' اور ''گداز'' کی کمی ہے، ایک مبہم اندازِ بیان سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ مختلف اوقات پر ایک فنکار مختلف کیفیات سے متاثر ہوتا ہے، ان میں خارجی محرکات بھی ہوتے ہیں۔ کبھی شعر میں ایک جذباتی کیفیت ہوتی ہے، کبھی اس میں گہرا تفکر ہوتا ہے اور کبھی ایک سادہ سی حقیقت کا اظہار۔ ایک ہی شاعر کے ہاں کبھی ''گرمی'' (اگر اس لفظ کے کچھ معنی ہیں تو) ہو سکتی ہے اور کبھی نہیں اور پھر ''گرمی'' اور ''گداز'' کا معیار کیا ہے؟ ہر شخص کے نزدیک اپنا اپنا!

اس بات کی مثال کہ عورت کی ہم نشینی ''گرمی'' اور ''گداز'' کا باعث ہوتی ہے، صرف ایک جگہ سے ملتی ہے، جہاں سے اس کی بہت ہی کم توقع تھی۔ یعنی ''تصوف'' کے مطالعے سے، بقول فرید الدین عطارؒ ۲۶، حضرت حسن بصری ۲۷، کہا کرتے تھے

کہ جب تک رابعہ بصری ۲۸؎ میری مجلس میں شامل نہیں ہوتی اس میں گرمی پیدا نہیں ہوتی! میرے نزدیک اس کی حقیقت ایک ''رومانی عنصر'' سے زیادہ نہیں، جو حضرت حسن بصری کی زندگی میں شامل تھا اور جسے اکثر تذکرہ نگاروں نے نجانے کیوں نظر انداز کر دیا...

عورت اور مرد میں جو نسبت ہے اس کے متعلق ایک تاریخی واقعہ یاد آ گیا جسے مورخین نے محض ایک لطیفے کے طور پر بیان کیا ہے لیکن میرے نزدیک اس میں ''مردوزن'' کے تعلقات کے متعلق زندگی کی ایک بڑی حقیقت پوشیدہ ہے۔

مولانا سعد الدین تفتازانی، ۲۹؎ تفتازان کے ایک قصبے ''نسا'' کے رہنے والے تھے۔ ایک روز کسی نے مولانا سے مزاح کے طور کہا۔ ''ہم تو آپ کو مردوں میں سے سمجھتے تھے، لیکن آپ تو عورتوں میں سے (از نسا) نکلے۔'' مولانا نے جواب دیا ''او بے خبر، تم نے سنا نہیں کہ الرجال من النساء!''

گوئٹے ۳۰؎ کا قول ہے کہ ہر اچھے انسان میں نسائیت کا عنصر ہوتا ہے وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اچھی عورتوں کی صحبت میں صحیح انسانی اطوار نشو و نما پاتے ہیں اگرچہ اس کا ثبوت مشرقی تہذیب سے بھی ملتا ہے لیکن میں پھر وہی بات دہراؤں گا کہ ان اقوال کی حیثیت میرے نزدیک اس سے زیادہ نہیں کہ عورت کو چند نظریوں کے درمیان ''محصور'' کر کے رکھ دیا جائے۔

اس بات کے پیش نظر کہ ''مردوزن'' زندگی کے سفر میں ایک دوسرے کے دوش بدوش رواں ہیں۔ میں یہ کہا کرتا ہوں کہ علمی نظریوں نے جن میں سے بعض کا ذکر تم نے بھی کیا ہے، عورت اور مرد کے درمیان ایک مصنوعی خلیج پیدا کر دی ہے۔ اسے پاٹنے کا ہمارے یہاں صرف ایک علاج ہے اور وہ یہ کہ تعلیم کے وہ تمام مذہبی ادارے بند کر دیے جائیں جو غلط نظریوں پر قائم ہیں۔

بچپن ہی سے (بلکہ ''بسم اللہ'' کے دن سے) عورتوں اور مردوں کی مخلوط تعلیم لازمی قرار دی جائے اور کم از کم پرائمری درجوں کی تعلیم خالصتاً صحیح طور پر تعلیم یافتہ عورتوں کے سپرد کی جائے۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو مجلسی بدمزگیاں جاری رہیں گی۔ مثلاً عورتوں کی صحبت میں چھچھورے پن کا اظہار کرنا، خاص طور پر جب اس صحبت میں اور مرد بھی شامل ہوں یا ان کی موجودگی کی وجہ سے دوسروں پر اپنا تفوق جتانا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت میں جو خامیاں رہ جاتی ہیں اگر وہ ایک خاص عمر تک پہنچنے کے باوجود باقی رہیں تو پھر زندگی بھر دور نہیں ہوسکتیں۔ اس لیئے ضروری ہے کہ ابتدا ہی سے نظام تعلیم کو بدلا جائے اور یہ ایک فرد کا کام نہیں، پورے سماج کا کام ہے۔ حکومت یہ کام کر سکتی ہے بشرطیکہ ہماری قوم رضا شاہ پہلوی ۳۱؎ یا مصطفیٰ کمال پاشا ۳۲؎ جیسا انسان پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ عورت سے متعلق یہ سب باتیں خطبۂ نکاح میں شامل ہونی چاہئیں، بلکہ کبھی کبھی شادی شدہ لوگوں کو بھی سنانی چاہئیں بشرطیکہ خطبہ کے ساتھ ایک عدد بیوی کا اضافہ نہ ہو۔''

''فلسفہ ضدین'' کی خرابیوں کی طرف میں نے اس وقت توجہ کی تھی جب علامہ اقبال نے اس بات کا اعلان کیا کہ ''مادہ'' "Matter" اور ''روح'' "Spirit" میں سے ایک کو حقیقت قرار دے کر دوسرے کو رد کر دینا مغربی و مشرقی تمدنوں کی مشترکہ غلطی "Common mistake" ہے۔ اس نظریے کی ذمہ داری کچھ سائنس پر عائد ہوتی ہے اور کچھ غلط مذہبی تصورات پر، ہم نے ''شیطان و یزداں'' اور ''خیر و شر'' کے نظریوں کا دامن تو پکڑ لیا لیکن توحید کے نظریے کو بھول گئے۔ جب تک توحید کا نظریہ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری نہیں ہوتا۔ ''فلسفہ ضدین'' سے نجات نہیں مل سکے گی۔ اس نظریے کا بدترین اثر اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب یہ ہماری جذباتی زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کی اس بات سے متاثر ہو کر میں نے اردو غزل کی روایات پر غور کیا اور شروع شروع میں شعوری طور پر ان نظریوں سے دامن بچانے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ اردو شاعری کی اس

''روایت'' سے بغاوت میری زندگی اور شاعری کا ''بے ساختہ پن'' بن گئی مثلاً

عشق ہے عشق فقط اس میں ''جفا'' ہے نہ ''وفا''
ان پر تہمت بھی ہے یہ مجھ پہ یہ الزام بھی ہے
میان عشق و ہوس ہے مقام دیدہ و دل
نہ ''عشق'' عین حقیقت نہ ہے ''ہوس'' باطل!
یہ تمیز ''عشق'' و ''ہوس'' نہیں یہ حقیقتوں سے گریز ہے
جنھیں عشق سے سروکار ہے وہ ضرور اہل ہوس بھی ہیں

اور وہ پوری مسلسل غزل اسی انداز میں ہے جس میں ''عاشق'' اور ''محبوب'' کی تفریق غائب ہے۔ جس میں دو انسانوں کا ذکر ہے اور جس کا مطلع یہ ہے۔

وہ مجھ سے، میں ان سے ہوں گریزاں
تنہا تنہا اداس حیراں
یہی عیشِ ملاقات اور یہی فکرِ جدائی تھا
ہوئے دست وگریباں رنج وراحت اس سے پہلے بھی
ہجر و وصل کے مارو تم یہ راز کیا جانو
قرب ہو کہ دوری ہو یار دلستاں اپنا''

کیا عقل و وجدان کی تسکین (Comman Name) کے لیے مختلف اوقات میں الگ الگ میدان عمل ہوسکتا ہے۔ اور کیا اعلیٰ قوائے انسانی کی تخلیق اس طور پر واقع ہوئی ہے کہ ایک وقت میں ''عقل'' اور ''وجدان'' میں سے صرف ایک چیز اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ پہلے سوال کا جواب اثبات میں ہے۔ اور دوسرے کا نفی میں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر دوسرے سوال کا جواب نفی میں ہے تو پہلا سوال پیدا ہی نہیں ہونا چاہیے، لیکن ایسا نہیں۔

۲۷ راگست

۷۱۔ گارڈن روڈ

زندگی میں کتنے ''موقعے'' اور ''انسان'' ایسے ہوتے ہیں جو ''عقل'' اور ''وجدان'' دونوں کو آسودہ کر سکتے ہیں۔ ہم کیوں فقط ایک ''موقعے'' یا انسان سے مطمئن نہیں ہوتے۔ تنوع کی تلاش میں کیوں رہتے ہیں۔ دن میں کئی بار اپنے مشاغل کیوں تبدیل کرنے پڑتے ہیں؟ اکثر لوگ اپنے حلقہء احباب کو ایک یا دو تک محدود کیوں نہیں کر سکتے؟ ہم مختلف عمروں، جنسوں، طبیعتوں اور مشغلوں کے لوگوں سے ملنا کیوں پسند کرتے ہیں۔ ایک دوست کی موجودگی دوسرے دوست کی کمی کو کیوں پورا نہیں کر سکتی۔ ان سب سوالوں کی تہ میں اور باتیں بھی ہو سکتی ہیں، لیکن بنیادی وجہ یہی ہے کہ ہر وقت اور ہر موقع پر انسان اپنی پوری شخصیت کو آسودہ نہیں کر سکتا۔ اس حقیقت کو فراموش کر دینے کے نتائج کبھی کبھی بہت دوررس ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی میں ایک خوبی ہے تو وہ شخص خود یا اس کے دوست دنیا بھر کی دوسری خوبیاں بھی اس کی ذات سے منسوب کر دیتے ہیں یا اگر اس میں کوئی ایک

خامی ہے تو وہ زمانے بھر کی خامیاں اس میں ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ انسانی شخصیت کی سالمیت اور اس کے تحفظ کیلئے ضروری ہے کہ اگر بیک وقت اس کے دونوں رخوں یعنی ''عقل و وجدان'' کی تسکین ممکن نہ ہو (جیسا کہ آج کل ہوتا ہے) تو مختلف اوقات اور مختلف حالات میں الگ الگ ان کی نشوونما میں کوشاں ہو اور اگر ایک شخص کسی پہلو کی تسکین نہیں کرسکتا، تو اس کی شکایت نہ کریں۔ اس امر کو نظر انداز کرنے سے ایسی مہلک کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں جو شخصیت کو تباہ کر دیتی ہیں۔ مثلاً خود غرضی، حسد، بغض، بدگوئی اور خودنمائی۔ اگر کوئی دوست ہماری اپنی ذہنی سطح کا ساتھ نہیں دے سکتا، تو محض اسی بنا پر اسے ترک نہیں کر دینا چاہیئے۔ اس کی دوسری خوبیوں کو دیکھنا چاہیئے۔ اگر صرف اس بنا پر ہم اسے ترک کر دیں گے تو یہ خود غرضی اور تنگ نظری ہوگی اور اگر وہ دوست اس بنا پر ہم سے الگ ہوجائے گا کہ شخصیت کے باقی پہلوؤں کی تسکین کیلئے ہمیں اور دوستوں کا مرہون منت ہونا پڑتا ہے تو اس میں حسد اور بغض کے جذبات پیدا ہوں گے اور یہ باتیں انسانی تعلقات کے لیے کتنی مہلک ہیں۔

اسی لیے میری انتہائی کوشش یہی ہوتی ہے کہ زیادہ تر صرف ان لوگوں سے ملوں، جو پوری شخصیت کو متاثر کرسکیں۔ اسی لیے میرے صحیح دوستوں کی تعداد نہایت محدود ہے، بلکہ نہ ہونے کے برابر اور مجھے اسی بات پر فخر ہے کہ یہ دوست بیک وقت میرے لیے ''ذہنی آسودگی'' اور ''قلبی انشرح'' کا باعث ہوتے ہیں۔

ہمارے تخلیقی کارنامے اس بات کا ثبوت ہیں کہ ''عقل'' اور ''وجدان'' کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور یہ اتنا واضح اور عالمگیر ثبوت ہے کہ دوسرے سوال میں جانے کی ضرورت نہیں۔

نجانے کتنے لوگ ہیں اس دنیا میں جو خود غرضی، حسد، بغض، بدگوئی اور خودنمائی کی شکل میں انسانی تعلقات کو نظر انداز کرنے کا ہرجانہ دیتے رہتے ہیں، جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ لیکن میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ لوگ اپنے ذہن میں دوسروں کی پستی یا بلندی کا ایک خودساختہ ''معیار'' مقرر کر کے اور ان کی نہایت مطمئن ''زندگی'' کو محرومیوں سے تعبیر کر کے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ وہ اپنی ان ''محرومیوں'' کا ضرور کسی نہ کسی شکل میں ہرجانہ ادا کرتے ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود ''اطمینانِ قلب'' سے محروم ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک اطمینانِ قلب کا ''فارمولا'' یہ ہے۔

اصول کی پابندی + عزتِ نفس + خلوص = اطمینانِ قلب۔ ہر انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی زندگی کے لیے ذہن میں چند اصول متعین کر لے۔ ان کا اعلان کیئے بغیر ان پر عمل کرے ہر حالت میں اور ہر موقع پر ان کا پابند رہے اور اگر کوئی عزیز ترین دوست بھی ان اصولوں کی پابندی میں رکاوٹ پیدا کرے تو اپنے آپ کو زندگی کی بہت بڑی قربانی کیلئے تیار رکھے۔

''اطمینانِ قلب'' کی دولت اس وقت نصیب نہیں ہوتی جب انسان ''اصول کی پابندی'' کی بجائے ''ضد'' ''عزتِ نفس کی بجائے ''خود بینی و تکبر'' اور ''خلوص'' کی بجائے ''بغض'' کو اپنی طبعیت کا جزو بنالیتا ہے۔

ایک دوست کے نام، ایک دوست کے خط میں سے جو فقرہ تم نے نقل کیا ہے۔ وہ ''عقل اور ''وجدان'' کے ''عدم توازن'' اور ''عدم تعاون'' کا نتیجہ ہے۔ ''disown کرنے کے معنی میرے نزدیک یہ ہیں کہ دنیا بھر کی خرابیاں اور خامیاں کسی سے منسوب کر دی جائیں اور اپنی برتری جتائی جائے۔ ایک معمولی سی بات کیلئے۔ کاش وہی معنی صحیح ہوتے جو آپ نے نکالے ہیں، یعنی ''دست گیری'' اور ''محتاجی''

''ناصر کے ہاں بچہ پیدا ہونے کی خبر کراچی آپ نے اس طرح سنی:

۱) صبیحہ ''جھوٹ''
۲) تمھاری ''ہونے والی'' بھابی ''بیچاری'' (تسکین؟)
۳) مجید ''I can't pocket it'' (شکر ہے ''Own'' نہیں کہا)
۴) ریاض قادر ''بھئی کیا کہہ رہے ہو۔ ابھی تو اس کی شادی...''
۵) غالب وانور (ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ پھر دونوں میری طرف دیکھ کر مسکرائے...)
۶) حفیظ ہوشیار پوری ''عرفان کاظمی''...(۱۳۷۲ھ)

لیکن حفیظ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ صبیحہ نے ناصر کی شادی کی تاریخ کہی تھی۔ ''ناصر کاظمی بانو'' (۱۳۷۱ھ) اسی کے باپ نے ناصر کے باپ بننے کی تاریخ یہ کہی ہے۔

''باباجان ناصر کاظمی''...(۱۳۷۲ھ)

''عرفان کاظمی'' نے اس دنیا میں داخل ہونے کیلئے جو ''قیصرانہ طریق کار'' اختیار کیا اس کے پیش نظر تاریخی نام ''قیصر کاظمی'' ہونا چاہیے تھا، لیکن اس کا کیا علاج کیا جائے کہ صرف ایک عدد کی کمی سے ایک نہایت اچھی تاریخ ''ضائع'' ہوگئی۔ قیصر کاظمی کے اعداد ہیں (۱۳۷۱) خیر تم اسے عرفان کاظمی کے ''سنگِ بنیاد'' کی تاریخ سمجھو کیونکہ یہ ۱۳۷۱ھ ہی میں رکھا گیا تھا۔''

Kazminia operation کی تاریخ ہے۔

''شگاف کاظمی''...(۱۳۷۲ھ)

جن لوگوں کو اس ''واقعے'' کا یقین نہیں آتا ان کی ترجمانی یوں کی ہے۔

''شعبدہ بازئ کاظمی''...(۱۳۷۲ھ)

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ''ابھی تو اس کی شادی...'' ان کا جواب یہ ہے۔

''حاضر جوابیءِ ناصر''...(۱۳۷۲ھ)

اگر ناصر کا مجموعۂ کلام اسی سال شائع ہو جاتا یا ۸۔۹ ستمبر تک شائع ہو جائے تو ان دونوں ''واقعات'' کی مشترکہ تاریخ یہ ہوگی

''تصنیفاتِ ناصر''...(۱۳۷۲ھ)

دو اور تاریخیں

''کارِ خیر ناصر''...(۱۳۷۲ھ)

''میراثِ بزرگانِ ناصر''...(۱۳۷۲ھ)

اور اگر ''بزرگانہ'' قسم کا نام درکار ہو تو

''ذاکر علی ناصر''...(۱۳۷۲ھ)

اور آخر میں اس مصرع پر ختم کرتا ہوں:۔

''مراد و مقصدِ تسکین و ناصر''...۱۳۷۲ھ

خط کی طوالت کیلئے معذرت چاہتا ہوں چند روز بند پڑا رہا۔ کھولا تو اس موقع کی تلاش میں رہا کہ اسے اپنے ''اردو مختصر نویس کو لکھواؤں کیونکہ اتنا طویل خط خود لکھنے میں دقت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن دفتری اوقات میں یہ کام ممکن نہ تھا، مختلف اوقات

میں اور مختلف مقامات پر بیٹھ کر مکمل کیا ہے مجھے معلوم نہ تھا کہ اتنا طویل ہو جائے گا اس سے تم خود اندازہ کر لو گے کہ میرے لیے کسی خط کا جواب دینا کس قدر مشکل ہے۔ کسی زمانے میں خطوں کے جواب لکھنے میں تمہاری طرح پابندی سے کام لیتا تھا لیکن اب وہ فرصتیں کہاں اور پھر روزانہ جو خط آتے ہیں ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ سب کا جواب باقاعدگی سے دینا ناممکن ہے۔

تمہارے خط میں ایک جواب طلب بات بھی ہے۔ وہ رہ نہ جائے اپنے کلام کا انتخاب۔ یہ دسمبر سے پہلے ممکن نہیں، میرے کاغذات کچھ یہاں ہیں، کچھ لاہور میں۔ کچھ بند ہیں اور کچھ بکھرے پڑے ہیں اور اب اس قدر کام جمع ہو گیا ہے کہ نہ صرف انتخاب کرنا ہے بلکہ چار زبانوں میں اپنے حالات لکھنے ہیں۔ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی میں۔ سب سے پہلی فرمائش کوئی چھ ماہ ہوئے مصر سے آئی تھی۔ لاہور میں جن صاحب نے یہ فرمائش مجھ تک پہنچائی وہ کئی خط یاددہانی کے طور پر لکھ چکے ہیں۔ بہرحال پہلے اردو میں لکھوں گا تو عربی میں کسی سے ترجمہ کراؤں گا۔"

دل وفا کا گنجینہ شوق بے زباں اپنا
حسن کے سوا ہوتا کوئی رازداں اپنا
ان کو بھول جانے کی ایک سعیء لا حاصل
یاد روز ہے ان کی اور امتحاں اپنا
ہجر و وصل کے مارو تم یہ راز کیا جانو
قرب ہو کہ دوری ہو یارِ دلستاں اپنا
لطفِ دوستاں شاید بے دلی کا باعث ہے
دل بھی ہے وہیں اپنا، ذکر ہے جہاں اپنا
دل میں ہے غمِ دنیا، لب پہ نام ہے ان کا
داستاں زمانے کی، رنگِ داستاں اپنا
ہم شکستہ پائی سے مطمئن رہے ورنہ
گردشِ زمیں اپنی، دورِ آسماں اپنا
گلستاں رہے باقی، رنگِ گلستاں کچھ ہو
حسرتِ بہار اپنی، حاصلِ خزاں اپنا
اک تمام شیرینی اک تمام رنگینی
طرزِ گفتگو ان کی، شیوہء بیاں اپنا
ان کی آرزو تھی یا جستجو حفیظ اپنی
ان کو پا لیا ہم نے، مل گیا نشاں اپنا
(۱۵ راگست ۱۹۵۳ء)

اہلِ لاہور کو سلام　　　　　　تمہارا حفیظ

نوٹ: املا حفیظ صاحب کے خط کے مطابق ہے۔

حواشی

تعارف

۱۔ شیخ منظور الٰہی، حمید نسیم، راقمہ کے نام خط، ۲۸ جون ۱۹۹۳ء۔

۲۔ صہبیب سے مکالمہ، یکم اپریل ۱۹۹۴ء۔

۳۔ حمید نسیم، راقمہ کے نام خط، ۱۸/ اگست ۱۹۹۳ء۔

۴۔ افکار، حفیظ نمبر، کراچی، ۱۹۷۳ء ص ۹۵۔

۵۔ سلطانہ مہر، سخن ور، تذکرۂ شعرائے پاکستان، صفحہ ۱۲۱۔

۶۔ حمید نسیم، راقمہ کے نام خط۔

۷۔ ظہیر کاشمیری، افکار حفیظ نمبر، ۱۹۷۳ء صفحہ ۷۳۔

۸۔ محسن بھوپالی، روزنامہ جنگ ادبی صفحات، ۱۷ جنوری ۹۴۔

۹۔ حالاتِ زندگی، نقوش، جولائی ۱۹۷۳ء صفحہ ۱۲۴۔ مصنف؟

۱۰۔ ڈاکٹر عبدالوحید، جدید شعرائے اردو، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۵۶ء، صفحہ ۷۵۴۔

۱۱۔ نقوش، جولائی ۱۹۷۳ء، صفحہ ۱۲۴۔

۱۲۔ شمس الدین بٹ، راقمہ سے گفتگو، کراچی، ۸ جولائی ۱۹۹۴ء۔

۱۳۔ اداریہ، روزنامہ حریت، ۱۲/ جنوری ۷۳ء۔

۱۴۔ ابن انشا، افکار، حفیظ نمبر مارچ ۱۹۷۳ء، صفحہ ۷۶۔

۱۵۔ انصار ناصری، ایک خط راقمہ کے نام، ۵/ اپریل ۱۹۹۳ء۔

۱۶۔ حسام الدین راشدی پنبہ کجا کجا نہم، قومی زبان، کراچی، انجمن ترقی اردو، دسمبر ۱۹۸۲ء صفحہ ۳۱۔

۱۷۔ حسام الدین راشدی، حفیظ کے چار خط، نقوش۔

۱۸ حمید نسیم، راقمہ کے نام خط۔

۱۹۔ احمد ندیم قاسمی، ایک خط راقمہ کے نام۔

۲۰۔ شفیع عقیل، حفیظ سے مکالمہ، افکار حفیظ ایڈیشن مارچ ۱۹۷۳ء، صفحہ ۸۵۔

۲۱۔ محشر بدایونی، افکار مارچ ۱۹۷۳ء، صفحہ ۵۹۔۵۸۔

۲۲۔ عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۹۴۹ء، صفحہ ۴۵۔

حواشی متن:

۱ شیخ صلاح الدین: حفیظ ہوشیار پوری، غالب احمد اور ناصر کاظمی سے بہت دوستی تھی۔ حنیف رامے انھیں اپنا مرشد سمجھتے تھے۔ ''میٹرو'' میں ہونے والی گفتگو سے دیگر تخلیق کار بھی فیض یاب ہوتے۔ ناصر کاظمی، انتظار حسین، شیخ صلاح الدین اور حنیف رامے کے مکالمے، ۱۹۵۵۔۵۶ کے زمانے میں ''ماہِ نو'' اور ''سویرا'' میں شائع ہوتے رہے جن میں ادب و

فلسفہ، تاریخ وتنقید اور تفسیرِ حیات سبھی پہلو زیرِ بحث آتے۔ بہت عالم انسان تھے۔ ہر قسم کا علم گھول کر پی رکھا تھا ادب و فلسفے سے گہرا تعلق تھا۔ تحریریں بہت کم ہیں، ایک ناول شائع ہوا تھا، منصوبے بہت یونیک قسم کے تھے۔ وہ ادیب کی حیثیت سے نہیں بلکہ عالم فاضل دوست کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ حفیظ نے ان کے بارے میں بہت سے فی البدیہہ اشعار کہے ہیں، جو دوستوں میں عرصہء دراز تک گردش کرتے رہے۔[۱] ناصر سے جذباتی تعلق تھا۔ ''ناصر ایک دھیان'' میں انھوں نے ناصر کی زندگی کے بہت سے پہلو نمایاں کیے ہیں۔ ناصر کو موسیقی سے بھی شغف تھا اور مصوری سے بھی۔ ناصر کے ذوقِ مطالعہ کے متعلق کہتے ہیں کہ ناصر اکثر مجھ سے کوئی کتاب مستعار لیتا اور رات بھر میں ختم کر کے صبح واپس کر دیتا۔[۲] حفیظ سے خاص تعلق خاطر تھا۔ راقمہ کے نام ایک خط کا اقتباس دیکھیے، جس میں اپنی بیماری کے باوجود، حفیظ سے محبت و تعلق کے تمام رنگوں کو بیان کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ''...حنیف رامے کی معرفت آپ کا مرقومہ خط مل گیا ہے۔ میں نے اس کو بغور پڑھ لیا ہے اور متن کے تقاضوں کے اپنے لیے عواقب پر بھی غور و خوض کر لیا ہے...۵ جنوری ۱۹۹۵ء کو مجھے ریڑھ کی ہڈی کا آپریشن کرانا پڑا، جو ساڑھے چار گھنٹے تک جاری رہا، اس کے نتیجے میں ڈاکٹروں نے کھانے پینے کے علاوہ ہر طرح کی بیٹھک ممنوع قرار دے دی ہے...ان حالات میں ایسی مسلسل بیٹھک ممکن نہیں ہے...اندریں حالات یہ وعدہ ہی کر سکتا ہوں کہ صحت کی بحالی کے بعد جو پہلے لکھنے پڑھنے کا کام سرانجام دوں گا وہ آپ کی فرمائش پورا کرنا ہوگا...صلاح الدین''[۳]

(۱۔ انتظار حسین، راقمہ سے گفتگو۔ ۲۔ اے حمید، ۲۰۰۰ء، لاہور کی یادیں، لاہور، سنگِ میل ۳۔ راقمہ کے نام شیخ صلاح الدین کا ایک خط)

۲۔ حسام الدین راشدی، پیر: (۲۰ ستمبر ۱۹۱۱ء۔ یکم اپریل ۱۹۸۲ء) لاڑکانہ میں راشدیہ خانوادے میں جنم لیا۔ والد سید حامد شاہ راشدی علمیت، روحانی فضیلت اور بزرگی وتقویٰ کے سبب قابلِ عزت جانے جاتے تھے۔ حسام الدین کے بڑے بھائی پیر علی محمد راشدی بھی سندھ کے مشہور سیاسی رہنما، بے باک صحافی، ادیب، محقق، اور سندھ کابینہ میں وزیرِ صحت، وزیرِ اطلاعات اور نائب وزیرِ اعلیٰ رہے۔ پیر حسام الدین راشدی اردو، فارسی، عربی، سندھی اور انگریزی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ سندھ کی تاریخ، تہذیب، فنون، آثار اور شعر وادب پر خصوصی توجہ تھی۔ ''پیر حسام الدین راشدی بنیادی طور پر ''تاریخ کے عالم تھے اور تاریخ کے حوالے ہی سے ان کی نظر مختلف علوم وفنون پر تھی۔ پیر صاحب نے سندھ کی تاریخ وتہذیب کے ان بنیادی مآخذ کو مرتب وشائع کر کے سندھ کی علمی وتہذیبی زندگی کو حیاتِ نو بخشی۔ آج جو سندھ کی نئی نسل علمی وتحقیقی کام کر رہی ہے، وہ پیر صاحب ہی کی تالیفات سے روشنی حاصل کر رہی ہے...پیر حسام الدین راشدی نے فارسی، سندھی اور اردو میں کم وبیش ۵۰ کتابیں تصنیف، تالیف اور ترجمہ کیں، جن میں محمد اصلاح کا تذکرۂ شعرائے کشمیر، میر علی شیر قانع ٹھٹھوی کے تذکرے تحفۃ الکرام، مقالات الشعرا، مکلی نامہ اور معیارِ سالکان طریقت بھی شامل ہیں۔''[۱]

''انجمن ترقی اردو کراچی، اردو کالج ٹرسٹ، انسٹی ٹیوٹ آف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز جامعہ کراچی اور ادارہء یادگارِ غالب کے بانی اراکین میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے سندھی ادبی بورڈ، حیدر آباد۔ ریسرچ

سوسائٹی آف پاکستان جامعہ پنجاب لاہور۔قومی عجائب گھر کمیٹی کراچی۔حاجی عبداللہ ہارون کالج کراچی جیسے اداروں کی گورننگ باڈی کے رکن کی حیثیت سے برسوں یادگار خدمات سرانجام دیں۔آپ کی خدمات کا دائرہ جامعات کے بورڈ آف سٹڈیز، اکیڈمک کونسل اور سنڈیکیٹ کے علاوہ غیر ملکی سفارتی معاملات تک وسیع ہے۔۔آپ نے ان تمام شعبوں میں اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار کیا۔۲

آپ کے ذاتی کتب خانے میں پندرہ ہزار سے زائد کتب عربی، فارسی اردو اور سندھی موجود ہیں۔'' متوفی یکم اپریل۱۹۸۲ء۔

(۱۔ڈاکٹر جمیل جالبی ماہ نامہ'' قومی زبان'' دسمبر۱۹۸۲ء۔ ۲۔ڈاکٹر تنظیم الفردوس، اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۶ء حفیظ ہوشیار پوری، روایتی تاریخ گوئی کا احیا مشمولہ ''خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ)

۳ غالب احمد...انور غالب: غالب احمد، شاعر کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں جانے جاتے ہیں، کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں، ''راحتِ گمنام'' نے بہت شہرت پائی۔۱ غالب و ناصر و شیخ صلاح الدین و انتظار حسین وہ ادیب و شاعر تھے جن کی دوستی میں ریا کاری، منافقت اور خود غرضی شامل نہ تھی اور ایک دوسرے کی تخلیقات کی تعریف اور تجزیہ دیگر سننے والوں پر مذکورہ شخصیت کے بہت سے در کھول دیتا تھا۔۲ ''پہلی بارش'' کے متعلق غالب احمد کہتے ہیں ''ناصر کاظمی کی یہ شاعری اردو کی پہلی بارش ہے اور ناصر کاظمی بزبانِ اردو بارش کا پہلا قطرہ۔''۳

انور غالب نثری ادب سے خصوصی دلچسپی رکھتی تھیں تین ناول بھی لکھے، ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

(۱۔انتظار حسین، راقمہ سے گفتگو۔ ۲۔شیخ صلاح الدین، ناصر کاظمی ایک دھیان۔

۳۔اے حمید، ۲۰۰۰ء، لاہور کی یادیں، لاہور، سنگِ میل۔)

۴ عمر خیام: (۱۰۴۸ء۔۱۱۲۳ء) پیدائش بمقام نیشاپور، خراسان، ایران۔نام غیاث الدین ابو الفتح ابن ابراہیم، عمر الخیام نیشاپوری۔ریاضی دان، محقق، سائنس دان، ماہرِ فلکیات، فلسفی و شاعر، ادب میں اسے پائندگی عطا کرنے میں رباعیات کافی ہیں۔عمر خیام کی رباعیات میں انسان کی بے وقعتی، زندگی کے فانی ہونے کا احساس، فلسفۂ غم، جبر و قدر کی آویزش، غیرت و خودی کا احساس اور حیات کے تسلسل کا اظہار غنائی انداز میں ملتا ہے۔مے و مے خانہ کے سارے علائم و تلازمات و استعارات، شرابِ انگبیں، وقت کی صراحی، قوس صراحی دار، مے نوش، بوئے شراب، دور جام، رندِ خراباتی، چھلکتا جام، خرابات، ساقی گری، مستی بھرا جام، تشنہ کام، قطرہ، جرعہ، بادہ، مے ناب، مے فروش، مغاں بادہ در جام، سبو، بے خودی، کوزہ گر، کوزہ خر، کوزہ فروش، غرض عمر خیام کی رباعیات میں زندگی بے خودی و ہشیاری کے تمام مراحل، مے و مے خانہ کے وسیلے سے ہی طے کرتی ہے۔سادہ اور سہل زبان میں حکیمانہ خیالات و افکار پیش کرنا عمر خیام کی خصوصیت ہے۔رباعیاتِ خیام کی تعداد ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ان کی تعداد ۶۶ سے لے کر ایک ہزار دو سو تک بیان کی جاتی ہے۔(مسرور الٰہی خان، ۲۰۰۹ء۔لاہور، جمہوری پبلی کیشنز)

۵ میر عماد...عہدِ صفوی کا نامور خطاط۔''برٹش میوزیم میں اس (میر عماد) کی وصلی ہے جو ۱۰۱۷ھ میں لکھی گئی اور جس پر بظاہر ''محمد عماد الحسینی'' لکھا ہے۔''۱ مولوی محمد شفیع، مقالاتِ محمد شفیع میں ''نوادر مخطوطات وغیرہا، در دانش گاہِ علی گڑھ'' کے

نوادرات کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے، ڈاکٹر مختار الدین آرزو کا ایک مضمون درج کرتے ہیں، جوان مخطوطات ونوادرات کے بارے میں ہے کہ جنھیں سلطان جہاں منزل کے ہال میں ذخیرہ کر دیا گیا ہے۔ اس کے منتظم ومنصرم ڈاکٹر مختار الدین آرزو ہی ہیں۔ وہ میر عماد کی وصلیوں کے متعلق رقم کرتے ہیں ''...۳۔ وصلی در نستعلیق، نوشتہ میر عماد الحسینی ۱۰۲۴ھ، اصفہان کا مشہور خطاط جو شاہ عباس صفوی کا درباری خطاط تھا۔ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وصلیاں تعداد میں زیادہ نہیں، اور اس کے ہاتھ کی مکمل کتابیں تو بے حد نادر ہیں، جامی کی تحفۃ الابرار نوشتہ میر عماد استنبول میں موجود ہے۔ کچھ اشعار بھی اس کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں، نثر میں لکھی ہوئی تین وصلیاں ہمارے ہاں موجود ہیں ۔'' ۲

''از خوش نویسان مشہور دوران صفوی می توان شاہ محمود نیشاپوری، میر علی تبریزی، سلطان محمود نور، حاج میرک خطاط و میر عماد خطاط را نام برد۔ میر عماد استاد مسلم خط نستعلیق است واوست کہ این شیوہ را بکمال رسانده است۔'' ۳

(۱۔ مولوی محمد شفیع، ۱۹۷۲ء مقالاتِ محمد شفیع۔ جلد اول، مجلس ترقی ادب لاہور ص ۳۹۳ ۲۔ مولوی محمد شفیع، ۱۹۷۲ء مقالاتِ محمد شفیع، جلد چہارم، مجلس ترقی ادب لاہور ص ۲۴۲ ۳۔ کتاب ایران، تاریخ ہنر، مؤلف: دکتر حبیب اللہ آیت اللہی، مرکز مطالعات فرہنگی بین المللی، ۱۳۸۰ش، ص ۲۸۸)

۶ کتب خانہ ملی، ایران: موجودہ رسمی نام ''سازمان اسناد و کتاب خانہ ملی جمہوری اسلامی ایران''۔ ۲۰۰۲ء میں نام کی تبدیلی عمل میں لائی گئی۔ ۱۲۶۸ ہجری قمری میں مدرسہ دار الفنون نے کام شروع کیا۔ بارہ سال بعد یہاں کتب خانہ بھی قائم کیا گیا۔ یہی مختصر کتب خانہ ''کتب خانہ ملی'' کا سر آغاز ثابت ہوا۔ ماہ شہریور ۱۳۱۶ شمسی میں تہران میں باقاعدہ افتتاح ہوا۔ اس کا شمار ملک کے جدید مظاہر میں ہوتا ہے۔ ''کتاب خانہ ملی تہران'' ملک کی قومی لائبریری کی حیثیت سے بڑی اہمیت کا حامل ہے اس کتب خانے کے چند اغراض و مقاصد مختصراً اس طرح سے ہیں۔

۱۔ کتابوں کو جمع کرنا۔ ۲۔ کتاب شناسی ملی ایران کی تیاری واشاعت۔

۳۔ مستند مصنفین کے ناموں کی اشاعت، تاکہ ان ناموں سے کسی بھی کتب خانے میں ان کی تصنیفات کو باآسانی تلاش کیا جاسکے۔ (ڈاکٹر عارف نوشاہی سے گفتگو)

۷ ''انجمنِ دوستداران کتاب تہران'': ایران کا مشہور اشاعتی ادارہ، ایرانی ناشروں کی پہلی انجمن جو محسن صبا نے اردی بہشت ۱۳۳۰ شمسی میں قائم کیا۔ اس کے قیام کے اغراض و مقاصد کچھ یوں تھے۔

۱۔ کتابوں، مصنفوں اور فن طباعت کے بارے میں جلسے اور تقاریب کا انعقاد۔

۲۔ کتابوں، خطاطی اور مصوری کے فن پاروں کی نمائش۔

۳۔ فن طباعت، مصوری اور تذہیب (آرائشی کام، عموماً قلمی نسخوں کے سرورق پر سونے سے صفحے کی آرائش اور جلد سازی سے متعلق امور) کی آگاہی دینے کے لیے مختلف اجلاس کا انعقاد۔

۴۔ یوم کتاب (کتاب کا دن منانا) کا آغاز، کتب میلے اور مصنفین اور طباعت کے پیشے سے منسلک افراد کا ادب دوست اصحاب سے تعارف کے مواقع پیدا کرنا۔

رضا شاہ پہلوی کے آخری دور، ۱۹۷۸ء تک یہ انجمن فعال رہی۔ بعد از آں مالی مشکلات اور انجمن کے بانی محسن صبا کی

ضعیفی کے سبب کام رک گیا۔

اس ادارے سے طبع ہونے والی چند ایک اہم کتابیں ''چند رباعیات خیام بخطِ میر عماد''، ''ترجیع بندِ ہاتف بخطِ عماد الکاتب'' ''غزلیات حافظ بخطِ محمد حسین'' ہیں۔ (ڈاکٹر عارف نوشاہی سے گفتگو)

۸۔ قزوین: تہران (ایران) کے مغرب میں ایک قدیم شہر، یہ شہر ایران سے بغداد و تہران جانے والی شاہراہوں پر واقع ہے۔ اسے شاہ پور نے تیسری صدی میں بسایا تھا۔ ۶۶۴ میں اس پر عرب قبضے کے بعد اسے دارالحکومت کا درجہ دے دیا گیا۔ ۱۰۹۰ء میں قزوین کے قریب قلعہ الموط پر حسن بن صباح قابض ہوا۔ شاہ طہماسپ کے دور میں فنِ تعمیر نے بہت ترقی کی اور کئی عظیم الشان مساجد و عمارات تعمیر ہوئیں۔ ۱۵۴۵ء سے ۱۵۹۸ء تک اس شہر کو دارالحکومت ہونے کا اعزاز بھی حاصل رہا۔ ۱۷۲۲ء میں کچھ عرصے کے لیے افغان بھی اس پر قابض رہے۔ پہلی جنگِ عظیم میں روسیوں نے اسے فتح کر لیا۔ باوجود اس کے کہ اس شہر کی تاریخ نشیب و فراز سے پُر رہی، یہ بڑا مردم خیز خطہ رہا۔ مشہور محدث اور سنن ابن ماجہ کے مصنف ابنِ ماجہ کا تعلق بھی اسی سرزمین سے تھا۔

۹۔ تبریز: ایران کی ولایت آذربائی جان کا ایک بڑا شہر، ایک روایت کے مطابق ملکہ زبیدہ، ہارون الرشید کی بیوی نے یہ شہر بسایا تھا لیکن بلاذری اور ابن فقیہ کے مطابق تبریز کی تعمیر جدید الروالازومی نے کرائی تھی۔ اس کے بھائیوں اور بیٹوں نے شہر کے گرد فصیل بنوائی تھی۔ یہ شہر زلزلوں کے ہاتھوں کئی مرتبہ اجڑا اور بسا۔ سیاسی طور پر بھی اجڑنا اور بسنا اس کا مقدر ٹھہرا۔ ۵۱۴ھ کے بعد سلطان محمود نے اس شہر میں کافی عرصہ گزارا۔ بعد وفات اس کے بھائی نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ مغل حملہ آور بھی اس شہر پر قبضہ کرتے ہیں اور ایک کثیر رقم بطور فدیہ لے کر واپس جانے پر رضامند ہوتے ہیں۔ یکے بعد دیگرے، تبریز پر جلال الدین خوارزم شاہ، ہلاکو خان ملک صدر الدین، اباقا، ایلخانی خاندان، تیمور، الوس، میران شاہ، کی حکومت قائم رہی۔ ۹۰۶ھ میں اسماعیل اول نے تبریز پر قبضہ کیا۔ ۹۲۰ھ میں جنگِ چالدران کی وجہ سے عثمانیوں کے لیے تبریز کا راستہ کھل گیا۔ ترکی خلیفہ عثمان پاشا نے تبریز کی حفاظت کے لیے مربع شکل کا ایک قلعہ ۳۶ روز میں بنوایا۔ تبریز شہر مراد رابع کے ہاتھوں مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ ۱۷۲۹ء میں نادر شاہ تبریز میں داخل ہوا۔ نادر کی وفات کے بعد ابراہیم خان نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ ۱۹۸۰ء میں زلزلے نے پھر اسے تباہ و برباد کیا۔ ۱۹۱۹ء تک اس شہر کی تاریخ بہت پر آشوب رہی۔ ۱۹۱۹ء میں جب رضا خان بطور ایک گورنر جنرل تبریز میں وارد ہوا تو اس نے یہاں پھیلی ہوئی بدنظمی پر قابو پایا۔ بعد میں یہی گورنر جنرل، ایران کا شہنشاہ بنا۔ تبریز کے قدیم ترین آثار عہدِ مغلیہ کے ہیں۔ یہ آثار بھی ویران ہو چکے ہیں، صرف نیلی مسجد کے کھنڈرات اب تک باقی ہیں۔ یہ شہر، خشک پھلوں، قالین اور چمڑے کی مصنوعات کی تجارت کے لیے مشہور ہے۔ (سید قاسم محمود ۱۹۷۵ء شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا)

۱۰۔ محمد حسین تبریزی: ایران کا مشہور خطاط، لاتعداد شاگرد، مشہور شاگردوں میں، میر عماد اور عبدالرشید دیلمی تھے۔

۱۱۔ اصفہان: ایران کا شہر، عہدِ صفوی کا دارالحکومت، تاریخ میں پہلی بار اس شہر کو کسی مرکزی شہر بننے کا شرف عباس اول ۱۵۸۶ء تا ۱۶۲۸ء کے عہد میں ہوا، دریائے زندہ رود پر تین خوب صورت پل تعمیر کیے گئے تھے۔ صفی اول نے اس پر چاندی کے پترے چڑھوائے۔ بعد کے کئی حکمرانوں نے خوبصورت عمارات بنوائیں۔ حسین مساجد کے لیے مشہور،

اسے بابل کے حکمران، بنوکد نصر نے یہودیوں کی آباد کاری کے لیے بسایا تھا۔ مسلمانوں نے اسے عہدِ فاروقی میں ۱۹ھ میں فتح کیا۔ ایک اور روایت کے مطابق ابوموسیٰ اشعری نے نہاوند کے بعد اصفہان کو فتح کیا۔ المعتز کے زمانے میں ایک بغاوت کے بعد اسے دوبارہ فتح کیا۔ اس بار شہریوں کی ایک کثیر تعداد قتل ہوئی۔ ۹۱۳ء میں یہ شہر سامانیوں کے قبضے میں آیا۔ ۱۰۳۰ھ میں غزنیوں کی قلمرو میں شامل ہوا۔ مغلوں کے حملے کے دوران میں خوارزم سلطان جلال الدین کے زیرِ کمان اس شہر کی فصیل تلے جنگ ہوئی۔ تیمور کے دور میں ہونے والی شورش کے نتیجے میں ستر ہزار افراد قتل ہوئے۔ ۱۱۲۹ میں عہد نادر شاہی میں کچھ امن وامان ہوا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک یہ شہر عالمی طاقتوں کی آویزش کا مرکز رہا۔ ۱۹۱۷ء میں اس شہر پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ بعد میں کئی حکمرانوں نے خوبصورت عمارات بنوائیں۔ اصفہان صنعتی شہر ہے یہاں کپڑے کے کارخانے قائم ہیں۔ دھات کا بہترین کام یہیں ہوتا ہے۔

۱۲ شاہ عباس صفوی: صفوی عہد کا مشہور بادشاہ، صفوی عہد کے سلاطین نے لگ بھگ سوا دو سو سال حکومت کی عرصہء حکومت ۱۵۰۲ء تا ۱۷۳۶ء ہے۔ اس خاندان نے مذہب کے نام پر سیاسی اقتدار قائم رکھا۔ بانی بادشاہ، شاہ اسمٰعیل، شیعہ مذہب سے گہری وابستگی رکھتا تھا اور سنیوں پر اس کے مظالم کی داستانیں، بہت دردناک رہیں۔ شاہ اسماعیل شیعہ مذہب کی بنیاد پر ایران میں ایک وطن پرست ملت بنا گیا، جو صدیوں تک متعصب رہی۔ شاہ عباس صفوی بھی سنی عمائدین اور فن کاروں کا سخت مخالف تھا اور انھیں قتل کروانے سے گریز نہ کرتا تھا۔ ''صفوی دربار میں اعلیٰ درجے کے شعرا کا فقدان ایک خاص اثر کے ماتحت وقوع پذیر ہوا ہے، کیوں کہ ناقدین شعر کی رائے ہے کہ باوجود یہ کہ ایران کسی عہد میں بھی اچھے شعرا کے وجود سے خالی نہیں رہا، صفوی عہد میں کوئی ممتاز شاعر وہاں وجود میں نہیں آیا۔ اس کی وجہ محیط کا وہ اثر ہے جو صفوی شعرا کی حد سے بڑھی ہوئی مذہبی عصبیت کی شکل میں ایران میں وقوع پذیر ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایران میں مذہبی اور خصوصاً شیعہ لٹریچر بکثرت شائع ہوا اور شاعری میں مرثیہ ائمہ اطہار ایک خاص اور مستقل حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔۔ شاہانِ صفویہ اپنی تعریف میں قصیدہ سننے کے بجائے ائمہ کے مصائب کی داستان کو زیادہ وقعت دیتے ہیں اور ابن الوقت شاعر بھی اس صنف میں دادِ قابلیت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔''

یہی وجہ کہ اس دور کے باصلاحیت اور حقیقی شاعر ہندوستان پناہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

''نظیری کے ہندوستان چلے آنے کے کئی اسباب ہیں، ایک تو یہ کہ ایران کا سیاسی ماحول اس کی شاعرانہ امنگوں کے لیے ناساز گار تھا۔ ایران پر اس وقت صفوی خاندان حکمران تھا اور یہ معلوم ہے کہ صفوی عہد میں صرف مذہبی اور اخلاقی ادبیات کو سرپرستی اور بزرگ داشت کے قابل سمجھا جاتا تھا۔ نثر میں اخلاقی کتابوں کا بازار گرم تھا اور نظم میں مرثیہ گوئی کو فروغ حاصل تھا۔ نظیری چوں کہ طبعاً غزل گو شاعر تھا، اس لیے ایران میں اسے اپنا مستقبل دھندلا نظر آتا تھا۔''

''شاہ عباس اول بہ دلیل کارھای اساسی و بنیادی کہ انجام داد بہ لقب ''کبیر'' ملقب شد او ۴۳ سال پادشاہی کرد، در زمان او صنعت و ہنر فرہنگ رونق زیادی یافت۔ وی پایتخت را از قزوین بہ اصفہان منتقل۔ ساخت وکاخ ہا مساجد و بناہائے عام المنفعتہ باشکوہ بنیاد کرد۔

(ا۔ قاضی فضل حق، مقالات خان صاحب، ۲۰۰۶ء قاضی فضل حق، سنگِ میل پبلی کیشنز، ص ۱۶۷

۲۔ بذل حق محمود، ۲۰۰۳ء، مضامین بذل حق محمود، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ص ۱۰۴۔
۳۔ کتابِ ایران، تاریخ ہنر، تاریخ ہنر، مؤلف: دکتر حبیب اللہ آیت اللہی، مرکز مطالعات فرہنگی بین المللی، ۱۳۸۰ اش، ص ۲۷۳)

۱۳۔ میناتور: مینا کا کام، وہ سبز کام جو شیشے اور چاندی سونے کے زیورات اور برتن پر کیا جاتا ہے۔ سونے چاندی کے زیورات کا جڑاؤ کام۔ (لغات فیروزی ۱۹۱۲ء لاہور، مفیدِ عام)

۱۴۔ کاشی کاری: منسوب بہ کاشان، ایران کا ایک شہر، ایک قسم کی اینٹ یا ٹھیکری، جس پر نقاشی کی جاتی ہے، شیشے کے مختلف رنگوں کے ٹکڑے کوٹ کر ملائے جاتے ہیں اور جب کاشی کار اپنے فن کا نمونہ مکمل کر چکتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ چینی کا کوئی برتن یا کوئی آرائشی نمونہ رکھا ہوا ہے۔ (لغات فیروزی ۱۹۱۲ء لاہور، مفیدِ عام)

۱۵۔ میر عبدالغنی تفرشی: گیارھویں صدی ہجری، عہدِ صفوی کا رباعی اور غزل گو شاعر۔

۱۶۔ علی رضا: از اہل صفاہان ست سابقاً ثلث رامی نوشت چون شاہ عباس ماضی را با میر عماد بسببی کہ بالا ذکر یافت شوء مزاجی بہم رسیدہ بود ملا علی رضا کہ بخدمت کتاب داری وتقریب اختصاص داست تربیت نمودہ بجای رسانید کہ مرقعی از خط ملا میر علی وخط او جمع نمودہ کہ ہمان ترکیبی کہ ملا نوشتہ بود او ہم نوشت وتمام مرقع بہمین دستور مجلد شدہ کہ دو صفحہء قرینہء اولین خط ملا است ودو یمین خط ملا علی رضاست داد خوش نویسی دادہ۔ (اقتباس از تذکرہ محمد طاہر، نصر آبادی، مقالات محمد شفیع۔ ص ۲۰۹)

۱۷۔ ابو تراب اصفہانی: خطاطی میں ابتدا میں ''فائزی'' کے شاگرد تھے، بعد میں میر عماد کی شاگردی اختیار کی اور خطاطی میں میر عماد کے جانشین مقرر ہوئے۔ خطِ نستعلیق کے بہت بڑے استاد مانے جاتے تھے۔ شاگردوں کی ایک بڑی تعداد ان کے فن سے فیض یاب ہوئی۔ رئیس خطاط کا لقب ملا، ۱۰۷۲ھ سال وفات ہے۔

۱۸۔ عبدالرشید دیلمی: ''شاہ جہاں کو اپنی جنم بھومی لاہور سے بہت لگاؤ تھا۔ اس نے یہاں عمارتوں کی تزئین و آرائش کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور دنیا کے گوشے گوشے سے ہنرمند یہاں اکھٹے کر لیے۔ اس دور میں وسطی ایشیائی ایرانی ترکی، انداز میں خطاطی سے مزین کتبات میسر ہیں۔ اس کے عہد میں میر عماد ایرانی کا شہرہ برصغیر میں تھا جو کوئی میر عماد کی وصلی (خوش نویسوں کے مشق کرنے کا دوہرا کاغذ) شاہ جہان کو پیش کرتا، یک صدی منصب پاتا۔ شاہ عباس صفوی کے دور میں عماد کے قتل کے بعد اس کا بھانجا عبدالرشید دیلمی، ترکی سے ہوتا ہوا لاہور پہنچا اور یہاں کچھ عرصہ قیام کیا اس طرح لاہور نستعلیق کہ پہلے مرکز کے طور پر ابھرا۔ رشید دیلمی کے ذریعے میر عماد اور مالک دیلمی کے خط کی خصوصیات لاہور پہنچیں اور نستعلیق میں انتہائی جاذبِ نظر مخطوطات تیار ہونے لگے۔ رشید دیلمی کا ہی فیضان ہے کہ برصغیر میں خطاطی کے علاقائی سکول لاہور، دہلی اور آگرہ کے خطاط آج بھی اپنا سلسلہ تلمذ اسی خطاط سے جوڑتے ہیں... عبدالرشید دیلمی کی طرزِ خاص لاہوری طرز کے طور پر مشہور ہوئی۔ جسے آج تک برصغیر کے سربرآوردہ خطاطوں نے اپنایا... رشید دیلمی کے طرزِ روش کو محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں محمد افضل لاہوری نے اس قدر اپنایا کہ انھیں آقائے ثانی کہا جاتا ہے۔ دہلی میں یہ روش انھی کے ذریعے پھیلی، جب کہ لکھنو میں قاضی نعمت اللہ لاہوری اور حافظ نور اللہ لاہوری اس طرز کے فروغ کے ذمے دار ثابت ہوئے۔''[۱]

مختار الدین آرزو میر عبدالرشید دیلمی کے تعارف اور اس کی وصلیوں کے متعلق لکھتے ہیں۔ "...۱۰۔ وصلی عبدالرشید دیلمی، یہ میر عماد کا مشہور شاگرد اور عزیز ہے عماد کے قتل کے بعد عہدِ شاہ جہان میں وارد ہوا اور دارا شکوہ کا استاد مقرر ہوا۔ خطاطی کے مسلم الثبوت اساتذہ میں اس کا شمار ہے۔ ۱۰۸۱ھ میں آگرہ میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوا۔ اس کی لکھی ہوئی پانچ وصلیاں ہمارے یہاں (سلطان جہان منزل میں) موجود ہیں۔ رام پور میں متعدد وصلیوں کے علاوہ گلستان سعدی کا نسخہ دیلمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے جو میر عماد کے نسخے سے منقول ہے ...دیلمی کی بہت پیروی کی گئی۔ حافظ نور اللہ ۱۱۶۵ھ اور رحیم اللہ ۱۲۹۱ھ عبدارشید دیلمی کے بڑے متبع تھے اور ان کے خط کی ایسی نقل کرتے تھے کہ کوئی پہچان نہ سکتا تھا اکثر اوقات قطعات پر اپنے نام کی جگہ دیلمی کا نام درج کر کے لوگوں کو، نادر و نایاب کہہ کر دے دیا کرتے تھے۔"[۴]

(۱۔ ڈاکٹر محمد اقبال بھٹہ ۲۰۰۷ء، لاہور میں فن خطاطی، لاہور، علم و عرفان پبلشرز۔

۲۔ مولوی محمد شفیع، ۱۹۷۲ء مقالات محمد شفیع، جلد اول، مجلس ترقی ادب لاہور ص ۳۹۳۔

۳۔ مولوی محمد شفیع، ۱۹۷۲ء مقالات محمد شفیع۔ جلد اول۔ جلد چہارم، مجلس ترقی ادب لاہور ص ۳۹۳۔۳۹۴۔

۴۔ مولوی محمد شفیع، ۱۹۷۲ء مقالات محمد شفیع، جلد چہارم، مجلس ترقی ادب لاہور ص ۲۴۴۔۲۴۵)

۱۹ والہ داغستانی: علی قلی خان نام، والہ تخلص، اصفہان ۱۷ صفر ۱۱۲۴ھ میں پیدا ہوئے، عمر کا ایک حصہ اصفہان ہی میں گزرا، شش انگشتی کے نام سے مشہور تھے۔ ۱۱۴۴ ہجری میں صفوی حکومت کے خاتمے پر نادر شاہ ابشار نے حکومت سنبھالی تو والہ کے خاندان نے ہجرت کی اور ہندوستان آ گئے، ہندوستان آمد کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ والہ کے والد صفوی حکومت کے ایک اہم عہدے دار تھے۔ انھیں خطرہ تھا کہ نئی حکومت گذشتہ حکومت کے کارکنان پر سختی کرے گی، ۱۱۴۶ھ میں ہندوستان کے تاریخی شہر ٹھٹھہ کو مستقر بنایا۔ پھر ملتان اور بعدازاں شاہ جہان آباد دلی آ گئے۔ محمد شاہ کی حکومت تھی اس نے والہ کی بڑی قدر دانی کی یہاں انھیں بہت سی مراعات حاصل ہوئیں۔ "تذکرہ ریاض الشعرا" نمایاں کام ہے۔ یہ تذکرہ نایاب تھا، ۲۰۰۱ء میں ہندوستان سے ۳۳۸ صفحات پر مشتمل ریاض الشعرا کی اشاعت ہوئی۔ پروفیسر ڈاکٹر عارف نوشاہی نے والہ کے اردو کلام کا ذکر اپنے ایک مقالے بعنوان "والہ داغستانی کے دیوان کا ایک معاصر مخطوطہ اور اس کا کلام" مشمولہ ارمغان شیرانی، شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور ص ۳۱۵۔۳۲۴ میں بھی کیا ہے۔ فارسی دیوان کا یہ مخطوطہ، والہ ہی کی زندگی ہی میں کتابت ہوا۔ ۱۱۶۵ھ میں محمد رفیع سیستانی نے اسے رقم کیا ہے۔ یہ نسخہ افغانستان یا وسطی ایشیا میں تھا، پھر پاکستان ہوتا ہوا اس وقت برونائی دارالسلام کے مفتی اعظم کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ رباعیات و قصائد پر مشتمل ہے، چند رباعیات ایسی بھی ہیں کہ تین مصرے فارسی میں اور ایک اردو میں ہے یا اردو فارسی دونوں زبانوں کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس کے علاوہ کراچی سے ۱۹۷۱ء میں ممتاز حسن نے والہ کا دیوان بہت خوب صورت انداز میں شائع کیا۔ والہ کی زندگی کا خاص واقعہ چچازاد سے منگنی کا ہے کہ چچا زاد اصفہان میں رہ گئیں اور یہ ہندوستان آ گئے، یوں ان کی ساری شاعری ہجر و فراق کی روداد کہتی نظر آتی ہے۔ یہ قصہ اتنا مشہور ہوا کہ انیسویں صدی کے مشہور شاعر، (مرزا غالب کے سسر) میر شمس الدین فقیر دہلوی نے مثنوی "والہ سلطان" کے نام سے اسے نظم کیا۔ والہ کے دیوان میں بھی، خدیجہ سلطان کو مخاطب کرتے ہوئے کیفیتِ ہجر کے اشعار

کہے ہیں۔ بعد میں خدیجہ سلطان نے وہیں شادی کر لی۔ ادھر والہ کی شاعری میں اور زیادہ درد و سوز اس کی دلی حالت کو ظاہر کرنے لگا۔ والہ نے ۱۱۷۰ھ میں اودھ میں وفات پائی، بعض محققین کے نزدیک مقام وفات دلی ہے۔

(ا۔ عارف نوشاہی، والہء داغستانی کے دیوان کا ایک معاصر مخطوطہ اور اس کا کلام" مشمولہ نقدِ عمر، اورینٹل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۱۷۲)

۲۰ میر عماد کا قتل: ''از ولایت قزوین است خط نسخ و تعلیق را بمرتبہ رسانیدہ کہ حمل بر اعجازی توان کرد بعضی را اعتقاد آنست کہ خط میر از خط ملا میر علی صاحب حسن تر است، اکثر اوقات با اصفہان بودہ شہرت کاذبی بہ تسنن کردہ از غلوئی کہ شاہ عباس ماضی در محبت امیر المومنین داشت با او عداوت بہم رسانیدہ مقصود مسگر را گفت کہ ہیچ کس نیست کہ این سنی را بکشد مقصود ہمین گفتہ در ہمان شب کہ در حینی کہ بحمام (بود) او را بکشت این رباعی از و مسموع شد۔

جان از من و بوسہ از تو بستان و بدہ	زین داد و ستد مشو پشیمان و بدہ
سنزین یست نیست استای تلخ؟	گر دلب شکرین بگردان و بدہ!

''شاگرد، ملا محمد حسین تبریزی است۔ خط او را بر خط اوستادش ترجیح می دہند اکثر قطعہ و خط خود را بنام اوستادی کرد۔ اگر چہ خط خود را بنام اوستادی کرد۔ اگر چہ خط خود را بنام اوستاد کردن عیب است ازین جہت کہ بہتر از اوستادی نوشت۔ این را معیوب نداشتہ اند۔ شاہ عباس صفوی بسبب گمان تسنن یا تصوف کہ در حق آن یگانہء عصر داشت روزی بر زبان گذرانید کہ کسی نیست مرا از دست این مرد خلاص کند۔ یکی از صوفیان عالی این سخن شنیدہ بمجرد بر آمدن میر از مجلس سرش از تن جدا ساختہ بخدمت شاہ آورد۔ بر حقیقت مطلع شدہ افسوس بسیار نمود و از ان کردہ پشیمان بود اما۔

(ع) دریغ شود ندارد چو رفت کار از دست''۲

(ا۔ اقتباس از تذکرہ محمد طاہر، نصر آبادی، مقالات محمد شفیع۔ ص ۱۷۵۔ ۲۔ اقتباس از مرآۃ لعالم مقالات محمد شفیع، جلد اول، ہنروران و خط و نططان، مجلسِ ترقی ءادب لاہور، ۱۹۶۷ء ص ۲۰۷)

۲۱ انتظار حسین: ۱۹۲۵ء ڈبائی بلند شہر یوپی میں پیدا ہوئے۔ ہاپڑ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میرٹھ کالج سے ایم۔ اے کیا۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور میں سکونت اختیار کی اور صحافت کو بطور پیشہ اپنایا۔ روزنامہ امروز، آفاق، نوائے وقت اور مشرق سے وابستہ رہے۔ ادب لطیف کی ادارت بھی کی۔ تراجم، افسانہ اور ناول نگاری میں بے پایاں شہرت رکھتے ہیں۔ تصانیف: ''قائداعظم: ابتدائی حالات''، ''علامتوں کا زوال''، ''پاکستانی کہانیاں: پاکستانی افسانے کے پچاس سال''، ''بستی'' (ناول) ''نیا گھر'' (تذکرہ) ''جنم کہانیاں''، ''قصہ کہانیاں''، ''خیمے سے دور''، ''آخری آدمی'' ''کنکری''، ''دن اور داستان''، ''خالی پنجرہ''، ''گلی کوچے'' گھاس کے میدانوں میں''، ''چاند گہن''، ''آگے سمندر ہے''، ''کچھوے''، ''شہرِ افسوس''، ''نئے شہر، پرانی کہانیاں''، ''ملاقاتیں''، ''شہر زاد کے نام''، ''دلی تھا جس کا نام'' ''چراغوں کا دھواں'' (یادوں کے پچاس برس) ''اجملِ اعظم''، ''کلیلہ دمنہ'' (بچوں کے لیے) فلسفے کی نئی تشکیل''، ''نئی پود''، ''ناؤ: اور دوسری منتخب کہانیاں''، ''بوند بوند نظریے سے آگئے''، ''۱۸۵۷ء خیال نمبر (ناصر کاظمی)'' ''نئی پرانی کہانیاں''، ''سرخ تمغہ (سٹیفن کرین)''، ''مجموعہ انتظار حسین'' آگے سمندر ہے اور بستی انعام یافتہ کتب ہیں۔

(۱۔انتظار حسین، راقمہ سے گفتگو۔ ۲۔اے حمید،۲۰۰۰ء، لاہور کی یادیں، لاہور، سنگِ میل۔)

۲۲ نور عالم: انتظار حسین کے مطابق، بہت انٹلیکچوئل نوجوان تھے، صفدر میر و ناصر کاظمی کے ساتھ بہت ربط تھا۔ شعر و ادب سے گہرا تعلق تھا۔ باذوق انسان تھے، ملک سے باہر چلے گئے تھے وہیں انتقال ہوا۔ حفیظ ہوشیار پوری سے بہت دوستی تھی۔ ''صبیحہ کی فارسی دانی کا ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک دفعہ حفیظ نے مجھے، نور عالم، انتظار حسین اور شیخ صلاح الدین کو چائے پر بلایا۔ حفیظ، نور عالم کو نور قطب عالم کہتا تھا۔ صبیحہ فوراً بول اٹھی، یہ عالم ہیں یا عالم اور یہ قطب ہیں یا کتب۔ ہم سب حیران رہ گئے۔ حفیظ بھی لفظوں کا رسیا ہے لیکن یوں لگتا ہے کہ اس سلسلے میں اپنی بیٹی کا شاگرد ہے۔''

(۱۔انتظار حسین، راقمہ سے گفتگو۔ ۲۔اے حمید، ۲۰۰۰ء، لاہور کی یادیں، لاہور، سنگِ میل

۳۔ناصر کاظمی، ۱۹۸۶ء، خشک چشمے کے کنارے، لاہور، مکتبۂ دانیال، ص ۱۹۱)

۲۳ انور جلال: ذوالفقار تابش کے مطابق: قیامِ پاکستان کے بعد انور جمال شمزا، ان مصوروں میں سے ایک ہیں کہ جنھوں نے مصوری کو پوری سنجیدگی اور شعور کے ساتھ اپنایا۔ شمزا کا تعلق لاہور سے تھا، اس شہر کے باسی ہوں یا گلی کوچے، در و دیوار، محرابیں، عمارتیں ہوں یا روایات، یہاں کی تہذیب ہو یا ثقافت، سبھی انھیں بہت عزیز تھے۔ انھوں نے اپنے اظہار کے لیے تجرید کو اپنایا، مگر تجرید کو چیستاں کبھی نہ بنایا۔ اظہار اس کا مسئلہ رہا ہے، اس کے دل و دماغ میں کچھ انوکھی باتوں کا ذخیرہ تھا جو وہ دوسروں تک پہنچانا چاہتا تھا۔ یہ اظہار مصوری تک محدود نہ تھا، انھوں نے ناول، کہانیاں اور ڈرامے بھی لکھے اور شعر بھی کہے۔ ان کی کتابیں، زرد پتا، قصہ کہانی،، جینیئس، سوتے جاگتے، اور اکیلا آدمی، ادبی حلقوں میں ایک عرصے تک موضوع بحث رہیں۔[۱]

شمزا نوجوانی ہی میں نئی دنیاؤں کی تلاش میں انگلستان نکل گئے۔ ۱۹۴۷ء میں انھوں نے میوسکول آف آرٹ سے ڈپلوما حاصل کیا اور ۱۹۵۸ء میں انگلستان جا آباد ہوئے اور وہیں شادی کر لی۔ مصوری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وہیں عمر بھر مصوری کی تعلیم دیتے رہے۔ شمزا کی مصوری کی بے شمار نمائشیں اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک منعقد ہوئیں۔ مشترکہ بھی اور تنہا بھی، لیکن یادگار نمائش وہی کہلائی کہ جس میں تمام ان تھک تیاریوں کے باوجود اپنے ہی شہر کے منعقد ہونے والی اس نمائش میں شرکت نہ کر سکے۔ موت راہ میں حائل ہوگئی۔ لاہور شمزا کا شہر تھا۔ اس کے ہجر میں وہ آخری برسوں میں بہت بے تاب رہے۔ یہ بے قراری اور ہوم سکنس ان کے ہر فن پارے میں اپنی شکل دکھاتی ہے۔[۲]

انور جلال شمزا کی رہائش ''شیزان'' کی پچھلی گلی میں تھی، چائے پینے کے لیے اکثر وہ شیزان آتے اور وہاں کے پرسکون ماحول اور گرم چائے سے لطف اندوز ہوتے۔ ''شیزان کی پیشانی پر ابھی ویسی لکھائی میں بورڈ نہیں لگا تھا جیسا کہ بعد میں لگایا گیا۔ شیزان کے مالک نے انور جمال سے کہا کہ وہ ریستوران کے لیے اپنے مخصوص انداز میں انگریزی کے شیزان کے حروف لکھ دے، تا کہ اس کا نیا بورڈ بنوا کر باہر لگایا جائے۔ انور جلال جس طرح انگریزی میں اپنے نام کے دستخط کرتا تھا اس نے ویسے ہی الفاظ میں شیزان لکھ دیا ایس اور زیڈ بالکل ویسا ہی تھا جیسا انور جلال کے دستخطوں میں تھا۔ مجھے اس نے کچھ نہیں بتایا، ایک روز میں بیڈن روڈ سے ہوتا ہوا اس کے گھر گیا تو وہ کہنے لگا، ''اے حمید، میں نے اپنے دستخط شیزان والوں کے ہاں فروخت کر دیے ہیں۔''

پھر وہ مجھے مال روڈ پر شیزان کے سامنے لے آیا اور اس کی پیشانی پر لگا بورڈ دکھایا، وہ ہو بہو انور جلال کے دستخط تھے۔ ویسے ہی ایس اور زیڈ اور آخر میں اے کے حروف بنے ہوئے تھے۔انور جلال ٹھنڈا سانس بھر کر کہنے لگا۔
''میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ اپنے دستخطوں کا سودا کروں مگر مجبور ہو گیا، ان لوگوں کو میری یہ لیٹرنگ پسند تھی اور مجھے پیسوں کی ضرورت تھی، بس میں نے فروخت کر دیے۔اب میں ایسے دستخط نہیں کیا کروں گا۔''[۳]
(ا۔ماہِ نو، چالیس سالہ مخزن، جلد دوم، ادارہ مطبوعاتِ پاکستان اگست ۱۹۸۷ء، ص ۱۰۶۲۔۱۰۳۰۔
۲۔اے حمید، ۲۰۰۰ء، لاہور کی یادیں، لاہور، سنگِ میل، ص ۷۵۔۷۶۔۷۷۔
۳۔انتظار حسین، راقمہ سے گفتگو)

۲۴ ناصر: سید ناصر سلطان رضا نام، ناصر تخلص، ان کا خاندانی سلسلہ امام موسیٰ کاظم سے جاملتا ہے۔پیدائش انبالہ ۸ دسمبر، ۱۹۲۵ء، انبالہ سے میٹرک کیا۔اسلامیہ کالج لاہور سے ایف۔اے کیا۔بی۔اے کا امتحان، والد کی وفات کے سبب نہ دے سکے۔دو ڈھائی برس بعد دوبارہ لاہور آئے اور کئی ملازمتیں کیں، آخر ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہوئے۔کھانے پینے کے بے حد شوقین تھے، جس کا اندازہ ان کی ڈائریوں کے مطالعے سے کیا جاسکتا ہے، ان میں ہوٹلوں میں کھانے کی تمام تفصیلات درج ہیں۔۲مارچ ۱۹۷۲ء معدے کے سرطان کے عارضے میں وفات پائی۔کم عمری سے شاعری سے لگاؤ تھا۔حفیظ ہوشیار پوری کی وساطت سے ریڈیو تک پہنچے اور شاعری میں بھی حفیظ کی رہ نمائی کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں برگِ نے، سر کی چھایا، نشاطِ خواب، دیوان، پہلی بارش، خشک چشمے کے کنارے، چند پریشاں کاغذ، شامل ہیں۔میر تقی میر سے ذہنی و روحانی قربت میں ہجرت کا تجربہ، غم نصیبی اور یادوں اور راتوں کے سناٹوں کا تسلسل ہے۔ناصر ''میرؔ ہمارے عہد میں'' مشمولہ خشک چشمے کے کنارے میں لکھتے ہیں۔''میں نے میرؔ کے زمانے کو رات کہا تھا۔یہ رات ہمارے زمانے کی رات سے آملی ہے۔قافلے کے قافلے اس رات میں گم ہو گئے اور جو بچ نکلے وہ اس سے اب تک لڑ رہے ہیں 'رات' میر کی زندگی کا استعارہ ہے۔'' اس کی شاعری میں تنہائی اداسی، ملال، شب نوردی، غمِ جاناں، غمِ دوراں اور عصری حسیّت نے ایسے شاہکار تخلیق کیے ہیں جو طویل و مختصر بحروں میں سہلِ ممتنع کا انداز لیے، متنوع لہجے میں شعری افق پر اپنی علیحدہ شناخت قائم کرتی ہے۔
(ا۔انتظار حسین، راقمہ سے گفتگو۔ ۲۔اے حمید، ۲۰۰۰ء، لاہور کی یادیں، لاہور، سنگِ میل۔)

۲۵ سلیم شاہد: مشہور فنکارہ، خورشید شاہد کے شوہر، ریڈیو پاکستان سے تعلق۔شاد امرتسری، اکرم بٹ، رضی ترمذی، اخلاق احمد ریڈیو میں ان کے ہمراہ ہوا کرتے تھے۔نو مسلم تھے۔انگریزی ادب سے گہرا لگاؤ تھا، حتیٰ کہ اپنی شخصیت بھی اسی رنگ میں رنگ لی تھی۔دھیمے لہجے میں بات کرتے تھے، انگریزی ادب پر بات کرتے تو ان کے وسیع المطالعہ ہونے کا احساس ہوتا۔انور جلال شمزا اور اے حمید سے بہت دوستی تھی۔بہترین سگریٹ پیتے، میٹرو میں بیٹھتے تھے۔ہمیشہ عجلت میں رہتے تھے، چند منٹ کے لیے میٹرو آتے، ایک آدھ بات کرتے، ناصر سے شعر سنتے اور چلے جاتے۔بعد میں میٹرو میں بہت بیٹھنے لگے، بلکہ گھر چھوڑ کر میٹرو میں رہنے لگے۔شاعری سے بہت دلچسپی تھی۔
۲۔فرید الدین عطار: سلاجقہ کے دورِ حکومت میں چھٹی صدی ہجری کے وسط میں نیشاپور میں پیدا ہوئے۔زندگی کا بڑا

حصہ تحصیلِ علم، تہذیبِ نفس، تصوف وسلوک کی منازل طے کرنے ،اساتذہ کی خدمت اور سیاحت میں گزرا۔ پیغام کے لیے شاعری کو ذریعہء اظہار بنایا۔ ہر صنفِ شعر کو اپنایا۔ کلام میں قصائد، غزل اور مثنویاں موجود ہیں۔ شاعری کا خاص موضوع فلسفہء وحدت الوجود ہے۔ تصانیف کثیر تعداد میں ہیں جن میں منطق الطیر ،تذکرۃ الاولیا، دیوان قصائد وغزلیات زیادہ مشہور ہیں۔ ۶۲۷ھ میں مغلوں کے حملے میں شہید ہوئے۔ مزار شاد باغ، نیشاپور میں ہے۔

۲۷۔ حضرت حسن بصری: تابعین میں سے ایک۔ بزرگ صوفی، صاحبِ کرامات ولی، والد کا نام موسیٰ راعی، زید بن حارث کے آزاد کردہ غلام تھے۔ انھوں نے ۱۲ھ میں حضرت ابوبکر صدیق کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ حضرت حسن بصری کی پیدائش حضرت عمر کے زمانے میں مدینہ منورہ میں ہوئی۔ ام المومنین حضرت امِ سلمیٰ کی کنیز حضرت خیرہ کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عمرؓ کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ حضرت خیرہ کی خواہش پر آپ نے حسن نام رکھا۔ ایک روایت کے مطابق جب آپ پیدا ہوئے تو حضرت عمر نے انھیں دیکھ کر فرمایا ''اس کا نام حسن رکھو کیوں کہ اس کا چہرہ حسین ہے۔'' حسن کی پرورش آپ ﷺ کے گھر پر امہات المومنین کے زیرِ سایہ ہونے لگی۔ جب آپ کچھ بڑے ہوئے تو دیگر صحابہ کرام کے ہمراہ، مسجدِ نبوی میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ آپ کو یہ سعادت حاصل تھی کہ وہ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت انس بن عبدالمالک اور حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی احادیث محفوظ کرتے۔ چودہ سال کی عمر میں آپ اپنے والدین کے ساتھ بصرہ روانہ ہوئے۔ ابتدا میں آپ جواہرات بیچا کرتے تھے۔ اسی سبب، حسن لولوئی کے نام سے مشہور ہوئے۔ بصرہ علوم کا شہر تھا اور بصرہ کی مساجد صحابہ کرام اور تابعین سے بھری رہتی تھیں۔ جب عشقِ الٰہی کا غلبہ ہوا تو تمام مال ومتاع راہِ خدا میں پیش کر دیا۔ وہ عموماً حضرت ابن عباس کے ہمراہ رہتے اور ان سے تفسیر وتجوید کا علم حاصل کرتے۔ دیگر صحابہ کرام سے فقہ کا علم حاصل کیا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ حسن بصریؒ، کا شمار بصرہ کے مستند عالموں میں ہونے لگا۔ آپ ہفتے میں ایک مرتبہ مجمع عام میں وعظ فرمایا کرتے تھے۔ آپ کا بیش تر وقت، عبادت و ریاضت اور مجاہدے میں گزرتا۔ آپ سنتِ نبویؐ پر شدت سے کاربند رہتے۔ خوفِ الٰہی سے لرزہ براندام رہتے۔ آخر عمر میں بہت کمزور ہو گئے تھے۔ بدن پر گوشت نہ رہا۔ آپ مستجاب الدعوات تھے۔ ظاہری وباطنی علوم سے لبریز تھے۔ نفس کی خواہشات سے بغاوت کے خوگر تھے۔ ہشام بن عبدالمالک بن مروان کے دورِ حکومت میں ۱۱۰ ہجری میں وفات پائی اور بصرہ کی اسی مسجد میں مدفون ہیں جہاں علم وذکاوت سے بھرپور اسی (۸۰) سالہ زندگی، انھوں نے تحصیلِ علم اور تدریسِ علم میں گزاری تھی۔

۲۸۔ رابعہ بصری: بصرہ کی مشہور عارفہ۔ اولیا اللہ میں شمار ہوتا ہے۔ انتہائی غریب گھرانے سے تعلق، بچپن میں کسی نے پکڑ کر فروخت کر دیا تھا۔ آپ کی پاک طینت اور عبادت گزاری نے رہائی دلوائی۔ تمام عمر صحرا میں گوشہ نشین رہیں اور تجرد کی زندگی بسر کی۔ جب بصرہ تشریف لائیں تو ان کے گرد معتقدین اور شاگردوں کا ہجوم رہنے لگا۔ ان کی تعلیمات سے مستفید ہونے والوں میں مالک بن دینار، رباح بلخی، محدث سفیان ثوری شامل تھے۔ انتہائی عبادت گزار تھیں زہد و تقویٰ وکرامات کی شہرت تھی۔ بہت دعائیں مانگا کرتی تھیں۔ عشقِ حقیقی سے سرشار تھیں وہ ان اولین صوفیا میں سے تھیں

جنھوں نے بے غرض محبت کی تلقین کی۔ جب آخری وقت قریب آیا تو رفقا سے کہا کہ اللہ کے قاصدوں کے لیے راہ چھوڑ دیں، جونہی رفقا باہر نکلے، رابعہ بصری کو کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے سنا گیا، اور یوں انھوں نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کردی۔ (شاہ کار اسلامی انسائیکلوپیڈیا)

۲۹ مولانا سعد الدین تفتازانی: مشہور مفکر، شاعر، فلسفی، اور صاحب علم و دانش۔

۳۰ گوئٹے: (۱۷۹۴۔۱۸۳۲) جرمنی کا عظیم شاعر اور ڈراما نویس، پیدائش فرینکفرٹ۔ قانون میں سند حاصل کی لیکن دل چسپی کیمیا، علم الابدان اور فن تعمیر سے تھی۔ قدیم کلاسیکی ادب کا غائر مطالعہ کیا۔ ''ورتھر کی داستان غم'' سے ادبی دنیا میں تعارف کا آغاز ہوا۔ شہرت ''فاؤسٹ'' نے عطا کی۔ بعدازاں کئی ڈرامے اور منظومات منظرِ عام پر آئیں۔

۳۱ محمد رضا شاہ پہلوی (۲۶/اکتوبر۔۲۷/جولائی ۱۹۸۰ء) محمد رضا شاہ اپنے والد رضا شاہ پہلوی کے تخت سے دستبردار ہونے کے نتیجے میں دوسری جنگ عظیم کے بعد برسر اقتدار آئے۔ شہزادہ محمد رضا شاہ نے ۱۶/دسمبر ۱۹۴۱ء کو اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔ انھیں کئی خطابات سے سرفراز کیا گیا جن میں شہنشاہ، آریا مہر اور بزرگ ارتشتاران زیادہ مستعمل رہے شاہ ایران کے سفید انقلاب کے نتیجے میں ملک میں سیاسی معاشی اور سماجی استحکام پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہ ایران کو بین الاقوامی طور پر ایک ترقی یافتہ اور لبرل قوم کی حیثیت سے متعارف کرانا چاہتے تھے۔ تاہم ناقص منصوبہ بندی کے سبب غریب طبقہ غریب سے غریب تر ہوتا گیا۔ درمیانہ طبقہ بھی شاکی رہا کہ اس کے جمہوری اور مذہبی حقوق کو پامال کیا جارہا ہے۔ امیر طبقہ اپنی طاقت آسائشوں کے نشے میں مست رہا یوں طبقات کے درمیان تفاوت بڑھنے لگا۔ محمد رضا شاہ پہلوی سیکولر خیالات کے حامی تھے۔ اس لیے شعیہ مسلمان ان سے متنفر ہوتے جارہے تھے۔ ان کی آزادانہ اور لادینی پالیسیوں کے سبب عوام کی بے چینی میں مزید اضافہ ہوا۔ اسرائیلی ریاست کو تسلیم کرنے کے سبب آگ بھڑک اٹھی۔ ڈھائی ہزار سالہ جشنِ شہنشاہیت بھی انھیں بچانہ سکا اور ۱۶ جنوری ۱۹۷۹ء کو انھیں ایران چھوڑ کر مصر میں پناہ لینی پڑی۔ مصر میں ہی ۲۷ جولائی ۱۹۸۰ء کو انتقال ہوا۔ (سید قاسم محمود، شاہ کار اسلامی انسائیکلوپیڈیا)

حفیظ کا یہ خط ۱۹۵۳ء کا تحریر کردہ ہے۔ شہنشاہ ایران کے عروج کا دور ہے جب ان کی تعلیمی و صنعتی پالیسیاں ملک کو شاہراہ ترقی پر گامزن کررہی تھیں ان کی رہ نمائی کی تقلید کی خواہش بے جانہ تھی۔

۳۲ اتاترک: غازی مصطفےٰ کمال اتاترک جمہوریہ ترکی کے بانی اور پہلے صدر تھے۔ پیدائش سلونیکا۔ والد علی رضا آفندی کا تعلق فوج سے تھا۔ مصطفیٰ کم عمر ہی تھے کہ والد انتقال کر گئے۔ شمسی آفندی کے مدرسے میں جہاں جدید طرزِ تعلیم رائج تھا، داخل ہوئے۔ ۱۸۹۵ء میں مناستر کے فوجی سکول، ۱۸۹۹ء میں استنبول کے مدرسہ حربیہ اور ۱۹۰۲ء میں فوجی اکیڈمی میں داخلہ لیا فوج میں ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے کئی فتوحات حاصل کیں۔ ترکی کی صورت حال اندرونی و بیرونی سازشوں کے سبب دگرگوں ہوچکی تھی۔ یونانیوں کے ازمیر پر حملے کے سبب مصطفیٰ کمال نے اناطولیہ کا رخ کیا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ خلیفہ کی فوجیں ناکام ہو چکی ہیں۔ ازمیر پر یونانی قابض ہو چکے ہیں حکومت، سلطنت اور خلافت کے الفاظ اپنے مفاہیم کھو چکے ہیں۔ مصطفیٰ کے نزدیک اب نئی آزاد ریاست کی تشکیل ضروری ہوگئی تھی۔ ملک میں سیاسی اکھاڑ پچھاڑ اور بیرونی دباؤ بڑھتا جارہا تھا۔ ۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء یونانیوں نے پھر حملہ کیا۔ مصطفیٰ کمال کی حکمت

عملی اور تدبر نے جنگ جیت لی۔ اس فتح کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔۱۹۲۲ء میں مصطفیٰ کمال نے پورے ترکی کو آزاد کروالیا۔ اس کام یابی کے بعد اتاترک نے عثمانی حکومت کے خاتمے کے لیے اقدامات کا آغاز کر دیا۔ ۲۹؍اکتوبر ۱۹۲۳ء کو حکومت کے جمہوریہ ہونے کا اعلان ایک سو ایک توپوں کی گونج میں کیا گیا۔ اصلاحات کا آغاز ہوا۔ آئین سے ترکی کا مذہب اسلام ہونے کی شق ختم کر دی گئی۔ مدارس کا نصاب تبدیل کیا گیا۔ مذہبی تعلیم ممنوع قرار پائی، مساجد میں اذان کی ممانعت ہوئی۔ قرآن و نماز ترکی زبان میں پڑھنے کا حکم جاری ہوا۔ عربی رسم الخط کو رومن سے بدلا گیا۔ ہجری و رومی تقویم کی جگہ عیسوی تقویم رائج کی گئی۔ عورتوں کا پردہ ختم کیا گیا۔ مغربی لباس کو فروغ دیا گیا اور اسلام کی بجائے ترکی قومیت پر زور دیا گیا۔ ۴؍مئی ۱۹۳۱ء کو مصطفیٰ کمال کو تیسری مرتبہ صدر منتخب کیا گیا۔ ۲۴؍نومبر کو انھیں اتاترک کا خطاب دیا گیا۔ ۱۶؍نومبر ۱۹۳۸ء کو وفات پانے والے اتاترک نے ترکی، جسے یورپ کا مردِ بیمار کہا جاتا تھا، ترکی کی حیاتِ تازہ کے لیے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ مذہب کی مخالفت کے سبب ترکی کا ایک بڑا طبقہ ان سے مخاصمت بھی رکھتا تھا لیکن جدید ترکی کی ترقی کا ضامن بھی انھیں ہی جانتا تھا۔ (اسلامی انسائیکلوپیڈیا، ۹۳ص)

فہرستِ اسنادِ محولہ:

۱۔ اقبال بھٹہ، محمد، (۲۰۰۷ء)، ''لاہور میں فنِ خطاطی''، علم و عرفان پبلشرز، لاہور۔

۲۔ الٰہی خان، مسرور، (۲۰۰۹ء)، ''رباعیاتِ عمر خیام''، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور۔

۳۔ آیت اللّٰہی، حبیب اللہ، (۱۳۸۰ شمسی)، ''ایران، تاریخ، ہنر'' مرکزِ مطالعاتِ فرہنگی بیان المللی، تہران۔

۴۔ حمید، اے، (۲۰۰۰ء)، ''لاہور کی یادیں''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔

۵۔ صلاح الدین، شیخ، (۱۹۹۱ء)، ''ناصر کاظمی ایک دھیان''، آغا پبلشرز، لاہور۔

۶۔ فضل حق، قاضی، (۲۰۰۶ء)، ''مقالاتِ خان صاحب''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔

۷۔ قاسم محمود، سید، (۱۹۷۵ء)، ''شاہ کار اسلامی انسائیکلوپیڈیا''،

۸۔ کاظمی، ناصر، (۱۹۸۶ء)، ''خشک چشمے کے کنارے''، مکتبہ دانیال، لاہور۔

۹۔ محمد شفیع، مولوی، (۱۹۷۲ء)، ''مقالات محمد شفیع''، جلد اول اور جلد چہارم، مجلس ترقی ادب، لاہور۔

۱۰۔ محمود، بذل حق، (۲۰۰۳ء)، ''مضامین بذل حق محمود''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔

۱۱۔ لغات فیروزی، (۱۹۱۲ء) مفید عام، لاہور۔

۱۲۔ نوشاہی، عارف، (۲۰۰۵ء)، ''والہ داغستانی کے دیوان کا ایک معاصر مخطوطہ اور اس کا کلام''، مشمولہ: ''نقدِ عمر''، اورینٹل پبلی کیشنز، لاہور۔

رسائل:

۱۔ تنظیم، الفردوس، (۲۰۰۶ء)، ''حفیظ ہوشیار پوری، روایتی تاریخ گوئی کا احیا''، جرنل، اکتوبر، دسمبر، خدابخش لائبریری، پٹنہ۔

۲۔ جالبی، جمیل، (۱۹۸۲ء)، ماہ نامہ ''قومی زبان''، کراچی، دسمبر۔